جلد ۱۰۲ اکتوبر ۱۹۸۴ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

اِدارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ

کا دفتر

اچھرہ سے تبدیل ہوگیا ہے!

کرم فرماؤں سے گذارش ہے کہ دفتر سے ہر قسم کے رابطہ اور
خط و کتابت کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر رجوع فرمائیں

اِدارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ

گنج بخش روڈ، دربار مارکیٹ نزد داتا دربار لاہور

فہرست مضامین

عدد ۲	اکتوبر ۱۹۸۴ء مطابق محرم ۱۴۰۵ھ	جلد ۱۰۲

مسئلۂ قصاص و دیت پر خصوصی اشاعت (۳)

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

زرسالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

"مغربی جرمنی کی ایک نوجوان مسلم طالبہ نے اسلامی تعلیمات کے مطابق سر اور چہرہ ڈھکے رکھنے کا مقدمہ جیت لیا ہے۔ لنڈین یونیورسٹی کے محکمہ مردم شماری نے اس نوجوان طالبہ سے اصرار کیا تھا کہ وہ شناختی کارڈ کے لیے ایسی تصویر پیش کرے جس میں اس کا سر اور چہرہ کھلا ہوا نظر آئے ۔ جج کارل ہینز کیر نے اس مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے اس بات کی توثیق کی کہ ایک مسلمان عورت کو سر اور چہرہ ڈھانپے رکھنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ عیسائی راہباؤں کو۔ جج نے اس بات کو تسلیم کیا کہ مغربی جرمنی کا جمہوری آئین ملک میں رہنے والے تمام لوگوں کو مذہبی آزادی کے حق کی ضمانت دیتا ہے"۔

(بحوالہ عبارت، صفحہ خواتین ۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۸۴ء)

سوال یہ ہے کہ کیا مذہبی آزادی کے حق کی ضمانت جس قدر جرمنی کی مسلم اقلیت کو حاصل ہے، اتنی ہی پاکستان کی اکثریت کو بھی حاصل ہے؟ اگر نہیں تو کیوں؟

کیا یہ فیصلہ ایسا نہیں کہ ہم لوگ اس پر شرمسار ہوں کہ "کافر بیدار دل" حرم میں سوئے ہوئے مسلمانوں سے بازی لے گیا؟

غیر تو اسلامی قوانین پردہ کے تحت ایک مسلم خاتون کا یہ حق عدالتی اور قانونی سطح پر تسلیم کریں کہ اسے اپنے احکامِ دین کو توڑ کر شناختی کارڈ کے لیے کھلے سر اور چہرے کی تصویر فراہم کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، لیکن اپنوں کو یہ اصرار ہو کہ چہرہ بے پردہ

کی تصویر ضروری ہے۔

صریح احکام قرآن و سنت کے احکام کی تنسیخ کے لیے یہ عقلی و مصلحتی دلیل دی جاتی ہے کہ جعلی ووٹنگ کو روکنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ مگر جعلی ووٹنگ تو جعلی کارڈوں اور جعلی تصویروں کے ذریعے وسیع پیمانے پر ہو سکتی ہے۔ قانون شکنی کی یہ صورت اتنی قانونی ہو گی کہ گرفت کرنا آسان نہ ہو گا۔ پھر معاملہ اتنا ہی نہیں کہ کارڈ پر تصویر لگ گئی (جو بجائے خود غلط ہے) بلکہ عملاً ایسا ہو گا کہ اُمیدواروں کے پولنگ ایجنٹس مطالبہ کریں گے کہ ہمارے سامنے چہرہ بے نقاب کیا جائے تاکہ ہم تصویر کی تصدیق کر سکیں۔ اسی طرح پریزائیڈنگ آفیسر بھی صورت اور تصویر کی مطابقت کے لیے معائنہ کر سکتا ہے۔ یعنی ایک خاتون یا ایک لڑکی کئی "غرانٹوں" کے درمیان کھڑی ہو کر ایک ایک کو باہتمام خاص اپنا چہرہ دکھلائے گی کہ تصویر سے مل کر دیکھ لیجیے۔ ہمارے یہاں بے شمار گھرانے ایسے ہیں جو ماڈرن ازم اور تقلید افرنگ کی اس سطح تک نہیں پہنچے کہ ان کی خواتین اس طرح سب کے سامنے اپنے آپ کو "پیش" کر سکیں۔ اس صورتِ حال کا بُرا اثر دین سے وابستگی رکھنے والے اُمیدواروں پر پڑے گا جن کی خواتین ووٹرز زیادہ تر پردہ پسند ہوں گی۔ گویا اس طریقِ کار کو اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہماری انتخابی اسکیم کی ترازو کا پلڑا دین سے آزاد لوگوں کے حق میں جھکا رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح کی چھوٹی چھوٹی اسکیمیں مخالفینِ پردہ کے محاذ کی ہلکی ہلکی بمبنگ کارروائیاں ہیں۔ اور ایسی مختلف کارروائیوں کے نتیجے میں تدریجاً بے پردگی کو فروغ ایک ایسی ریاست کے زیرِسایہ ملے گا جس کے بنیادی دستوری مقاصد میں یہ نکتہ بھی شامل ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو اس قابل بنائے گی کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیاں اسلام کے اصولوں کے مطابق بسر کر سکیں۔ گویا ریاست کا اصولی رُخ کسی اور طرف ہے اور بیوروکریسی کے منصوبہ سازوں کی سمتِ سفر دوسری ہے۔

آیا کوئی متبادل صورت سرے سے ممکن نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں بہت سی بہترین صورتیں ممکن ہیں۔ مثلاً:۔

ایک یہ کہ ایک گھر کے ووٹروں (ماں باپ، دادا دادی، بہن بھائی، بیٹے بیٹیاں، جو یکجا رہتے ہوں) کے ووٹ اکھٹے درج ہوں اور وہ اکھٹے ہی بھگتائے جائیں۔ اب اگر ۱۳۹/D محلہ اولیا کے کریم بخش کے ساتھ اس کی بیوی اور بیٹی اور پوتی یا بہو کا ووٹ بھگت چکا ہے تو اب کوئی اور شخص کریم بخش کے گھر کی کسی خاتون کو ساتھ نہیں لا سکتا۔ قصہ ختم۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جس خاتون کے پاس نکاح نامہ، ملکیت جائیداد کی کوئی دستاویز یا کرایہ دار کا لکھا ہوا کرایہ نامہ، کسی طرح کی تعلیمی سند، اسلحہ کا لائسنس، ڈرائیونگ لائسنس، پاسپورٹ، ملازمت کا کارڈ، اسٹوڈنٹ ہونے کا کارڈ، ڈومی سائل سرٹیفکیٹ، کالج ڈگری یا نتیجہ امتحان کا کارڈ، یا کوئی دوسرا واضح ثبوت موجود ہو، اسے ایسی دستاویزوں کی بنیاد پر ووٹ دینے کا موقع دیا جائے۔ اور ان دستاویزوں پر کوئی باریک نشان کرنے پر لگا دیا جائے تاکہ انہیں کوئی دوسری خاتون استعمال نہ کر سکے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ ہاتھوں پر کسی زخم، پھوڑے پھنسی یا تل کا نشان موجود ہو یا کسی انگلی یا ناخن کی ساخت غیر معمولی طرز کی ہو تو اس کا اندراج ووٹنگ لسٹ میں پہلے سے کر لیا جائے، ورنہ ووٹر خاتون اس کا ایک الگ سرٹیفکیٹ کسی بلدیاتی ممبر یا صلوٰۃ کمیٹی کے چیئرمین سے بنوا لے۔ ضرورت ہو تو سرٹیفکیٹ کے مطابق ایسے نشان کو دیکھا جا سکتا ہے۔

سرسری طور پر سوچنے سے یہ دو تین صورتیں فوراً سامنے آگئی ہیں۔ اگر بیوروکریسی کے اساطین پردہ کرنے والی خواتین سے نفرت رکھنے کی وجہ سے ان کو کچلنے اور پریشان کرنے کے درپے نہ ہوں، بلکہ ان کا احترام کرنے والے ہوں (کیونکہ یہ ایسی خواتین ہیں جو مغربیت کے تند سیلاب میں چٹان بن کر بہت سے مفاد کی قربانیاں دیتے ہوئے اصولِ پردہ کا تحفظ کر رہی ہیں) تو ان کے زرخیز دانشورانہ دماغ بہت سی متبادل صورتیں سوچ سکتے ہیں۔

ہمارے کارپردازوں کے اونچے دماغ اپنے طرزِ فکر کے حق میں دُور دُور سے ڈھونڈ

دلیلیں لاتے ہیں۔ مثلاً پاسپورٹ رکھنے یا حج پر جانے والی خواتین کی مثال دیتے ہیں کہ آخر ان سفر دستاویزات کے لیے بھی تو تصویر کھینچی جاتی ہے، پھر شناختی کارڈ کے لیے کیوں نہ ہو؟

سوال یہ ہے کہ پاسپورٹ کے بین الاقوامی ضوابط کو بدلوانے کا کام بہ حیثیت اسلامی ریاست کے کارپردازوں کے تو آپ کچھ نہ کر سکے اور خود سعودی عرب کی حکومت کو تصویر کی متبادل کوئی صورت سجھا نہ سکے، اب آپ کی اس کوتاہی کی وجہ سے ہماری مسلم خواتین کو اضطراری نوعیت کی جو مشکلات درپیش ہیں، انہیں کو آپ دلیل بنا کر یہ کہتے ہیں کہ ایسی ہی کچھ اور مشکلات ہماری طرف سے بھی برداشت کر لو۔ یعنی آپ کی اسلامی ریاست دنیا کے مروجات کے خلاف کوئی نئی راہ نکالنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اسے تو بس مکھی پر مکھی مارتے رہنا ہے۔

نفاذِ اسلام کے متعلق لچھے دار باتیں کرنے والوں کو کبھی یہ سوچنا چاہیے کہ اگر ہر معاملے میں موجودہ دنیا کے مروجات ہی کو جوں کا توں اپنانا ہے اور ماڈرن ازم کی رَو جدھر بہا لے جانا چاہے، اُدھر ہی بہنا ہے تو پھر مزاحمت و مقاومت اور اقدام و پیش روی کے جذبات کے بغیر اسلام جیسا جہاد طلب دین کیسے نافذ کیا جا سکتا ہے۔

پاسپورٹوں وغیرہ کے متعلق ایک بات تو یہ سوچنے کی ہے کہ ان کا استعمال کرنے والی خواتین کی اکثریت تہذیبِ نو کی سحر زدہ ہے اور بقیہ اقلیت اضطرار و مجبوری کی بنا پر مروجہ صورت میں ان کا استعمال کرتی ہے۔ پھر پاسپورٹوں کا یہ استعمال عمر بھر میں دو چار بار ہو سکتا ہے۔ بخلاف اس کے انتخابات ـــــ مرکزی، صوبائی، بلدیاتی ـــــ وقتاً فوقتاً ہونے والا عمل ہیں۔ آخر یہ روز روز کا اضطرار اور وہ بھی اپنی اسلامی ریاست یا اپنے گھر میں کیا معنی رکھتا ہے۔ رہی حج والی مثال تو بہت کم مرد عمر میں ایک سے زیادہ مرتبہ حج کے لیے ملک سے نکلتے ہیں۔ خواتین کے لیے تو ایک مرتبہ کا نکلنا بھی غیر معمولی ہمت کی بات ہے ......

... حج جیسی بڑی عبادت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے عمر میں ایک مرتبہ ایک اضطراری صورت سے دوچار ہونا کچھ اور بات ہے اور محض سیاسی انتخابات کے لیے تھوڑی تھوڑی مدت بعد اپنی تصویریں لے کر پولنگ بوتھ پر جانا اور وہاں چہرہ کھولنے کے لیے بھی تیار رہنا شدید آزمائش ہے۔ اپنے ہی ملک میں، عین اسلامی ریاست میں، مسلم اکثریت کے درمیان کسی مسلم خاتون کا

ایسی آزمائش سے دوچار ہونا بہت افسوسناک ہے۔ مصلحتیں اور ضرورتیں اپنی جگہ مگر خدا کے واضح احکام اور تصویر کے بارے میں خدا کے رسولؐ برحق کی روشن ہدایات اور اسوۂ رسولؐ و صحابۂ رسولؐ کی قدر و قیمت بالاتر ہے۔ چند مجبورانہ صورتوں کے لیے استثنا کی جو تنگ سی پگڈنڈیاں شریعت و فقہ میں نکلتی ہیں ان کو کشادہ کر کے ہر ایک کو چوڑی اور کھلی شارعِ عام میں تو نہیں بدلا جا سکتا۔

بدقسمتی یہ ہے کہ متجددانہ ذہن حدود اور پابندیوں کو تو اپنے راستہ سے ہٹانا چاہتا ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے جو رخنے شریعت نے اضطراری رخصت کے لیے خود رکھے ہیں، ان کو پہلے دروازوں اور پھر شاہراہوں میں بدلنا چاہتا ہے۔ بس یہ ذہنیت باعثِ مصیبت ہے یہ اگر بدل جائے تو پھر یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔

اب ذرا ایک بار پھر جرمن عدالت کا متذکرہ بالا فیصلہ پڑھیے اور سوچیے کہ آیا ہم دینی ضروریات اور مسلم خواتین کے حقوقِ پردہ کا تحفظ کرنے میں ایک نظامِ کفر سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں؟ وہاں مسلم عورتوں کی تصویر کے بغیر شناختی کارڈ بن سکتے ہیں اور انتخابات ہو سکتے ہیں تو یہاں کیوں نہیں؟ کیا ہماری اپنی ہی کوئی بیماریٔ دل ..... ہمیں صحیح سمت میں سوچنے اور اقدام کرنے سے روک رہی ہے؟

للہ! موجودہ ذہنیت کو بدلیے اور اسلام کے قانونِ حجاب اور پردہ پسند مسلم خواتین کے حقوقِ پردہ کا احترام کیجیے ـــ ووٹنگ کے لیے شناختی کارڈوں پر عورتوں کو تصاویر چسپاں کرانے کی پابندی سے آزاد کرنے کا اعلان کیجیے اور جعلی ووٹنگ کو روکنے کے لیے دوسری تدبیریں سوچیے۔

اللہ کی رحمتیں ہوں ہر اس شخص یا ادارے پر جو راہِ ہدایت اختیار کرے اور خدا و رسولؐ سے سچی محبت کرے اور جو مرد یا عورتیں خدا و رسولؐ کی اطاعت کرنا چاہیں ان کا احترام اور ان سے تعاون کرے۔

حکمتِ سیّد مودودیؒ

شہادتِ امام حسینؓ کا مقصد

اقتباس کردہ:- محمد یوسف صاحب - ادارہ معارف اسلامی - لاہور

ہر سال محرم میں کروڑوں مسلمان، شیعہ بھی اور سنی بھی، امام حسینؓ کی شہادت پر اپنے رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان غم گساروں میں سے بہت ہی کم لوگ اُس مقصد کی طرف توجہ کرتے ہیں جس کے لیے امامؓ نے صرف اپنی جان عزیز قربان کی بلکہ اپنے کنبے کے بچوں تک کو کٹوا دیا۔ کسی شخص کی مظلومانہ شہادت پر اس کے اہلِ خاندان سے محبت وعقیدت یا ہمدردی رکھنے والوں کا اظہارِ غم کرنا تو ایک فطری بات ہے۔ ایسا رنج وغم دنیا کے ہر خاندان اور اس سے تعلق رکھنے والوں کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی کوئی اخلاقی قدر وقیمت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ یہ اس شخص کی ذات کے ساتھ اس کے رشتہ داروں کی اور خاندان کے ہمدردوں کی محبت کا ایک فطری نتیجہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ امام حسینؓ کی وہ کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے سیکڑوں برس گزر جانے پر بھی ہر سال ان کا غم تازہ ہوتا رہے؟ اگر یہ شہادت کسی مقصدِ عظیم کے لئے نہ تھی تو محض ذاتی محبت وتعلق کی بنا پر صدیوں اس کا غم جاری رہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں، اور خود امام کی اپنی نگاہ میں اس محض ذاتی وشخصی محبت کی کیا قدر وقیمت ہو سکتی ہے انہیں اگر اپنی ذات اس مقصد سے زیادہ عزیز ہوتی تو وہ اسے قربان ہی کیوں کرتے؟ ان کی یہ قربانی تو خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اس مقصد کو جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے۔ لہٰذا اگر ہم اس مقصد کے لئے کچھ نہ کریں بلکہ اس کے خلاف کام کرتے رہیں تو محض ان کی ذات کے لئے گریہ وزاری کر

سکے اور ان کے قاتلوں پر لعن طعن کر کے قیامت کے روز نہ تو ہم امام ہی سے کسی داد کی امید رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ ان کا خدا اس کی کوئی قدر کرے گا۔

اب دیکھنا چاہیے کہ وہ مقصد کیا تھا؟ کیا امام تخت و تاج کے لئے اپنے کسی ذاتی استحقاق کا دعویٰ رکھتے تھے اور اس کے لئے انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی؟ کوئی شخص بھی جو امام حسینؓ کے گھرانے کی بلند اخلاقی سیرت کو جانتا ہے، یہ بدگمانی نہیں کر سکتا کہ یہ لوگ اپنی ذات کے لئے اقتدار حاصل کرنے کی خاطر مسلمانوں میں خونریزی کر سکتے تھے اگر تھوڑی دیر کے لئے ان لوگوں کا نظریہ ہی صحیح مان لیا جائے جن کی رائے میں یہ خاندان حکومت پر اپنے ذاتی استحقاق کا دعویٰ رکھتا تھا تب بھی حضرت ابوبکرؓ سے لے کر امیر معاویہ تک پچاس برس کی پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ حکومت حاصل کرنے کے لئے لڑنا اور کشت و خون کرنا ہرگز ان کا مسلک نہ تھا۔ اس لئے لامحالہ یہ ماننا ہی پڑے گا کہ امام عالی مقام کی نگاہیں اس وقت مسلم معاشرے اور اسلامی ریاست کی روح اور اس کے مزاج اور اس کے نظام میں کسی بڑے تغیر کے آثار دیکھ رہی تھیں جسے روکنے کی جدوجہد کرنا ان کے نزدیک ضروری تھا حتیٰ کہ اس راہ میں لڑنے کی نوبت بھی آجائے تو وہ نہ صرف جائز بلکہ فرض سمجھتے ہیں۔

وہ تغیر کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ لوگوں نے اپنا دین نہیں بدل دیا تھا۔ حکمرانوں سمیت سب لوگ خدا اور رسول اور قرآن کو اسی طرح مان رہے تھے جس طرح پہلے مانتے تھے۔ مملکت کا قانون بھی نہیں بدلا۔ عدالتوں میں قرآن و سنت ہی کے مطابق تمام معاملات کے فیصلے بنی امیہ کی حکومت میں بھی ہو رہے تھے، جس طرح ان کے برسر اقتدار آنے سے پہلے ہوا کرتے تھے بلکہ قانون میں تغیر تو انیسویں صدی عیسوی سے پہلے دنیا کی مسلم حکومتوں میں سے کسی کے دور میں بھی نہیں ہوا۔ بعض لوگ یزید کے شخصی کردار کو بہت نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں جس سے یہ عام غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ تغیر جسے روکنے کے لئے امام کھڑے ہوئے تھے، بس یہ تھا کہ ایک برا آدمی برسر اقتدار آ گیا تھا لیکن یزید کی سیرت و شخصیت کا جو برے سے برا تصور پیش کرنا ممکن ہے اسے جوں کا توں مان لینے کے بعد بھی یہ بات قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ اگر نظام صحیح بنیادوں پہ قائم ہو تو محض ایک

برے آدمی کا برسرِ اقتدار آجانا کوئی ایسی بڑی بات ہو سکتی ہے جس پر امام حسین جیسا دانا و زیرک اور علم شریعت میں گہری نظر رکھنے والا شخص بے صبر ہو جائے۔ اس لئے یہ شخصی معاملہ بھی وہ اصل تغیر نہیں ہے جس نے امام کو بے چین کیا تھا۔ تاریخ کے غائر مطالعہ سے جو چیز واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یزید کی ولی عہدی اور پھر اس کی تخت نشینی سے دراصل جس خرابی کی ابتدا ہو رہی تھی وہ اسلامی ریاست کے دستور اور اس کے مزاج اور اس کے مقصد کی تبدیلی تھی۔ اس تبدیلی کے پورے نتائج اگرچہ اس وقت سامنے نہ آئے تھے لیکن ایک صاحبِ نظر آدمی گاڑی کا رُخ تبدیل ہوتے ہی یہ جان سکتا ہے کہ اب اس کا راستہ بدل رہا ہے اور جس راہ پر یہ مڑ رہی ہے وہ آخر کار اسے کہاں لے جائے گا۔ یہی رخ کی تبدیلی تھی جسے امام نے دیکھا اور گاڑی کو پھر سے صحیح پٹڑی پر ڈالنے کے لئے اپنی جان لڑا دینے کا فیصلہ کیا۔

تصحیح

ترجمان القرآن کے شمارہ ذیقعدہ ۱۴۰۲ھ کے صفحہ نمبر ۸۱ پر مولانا خلیل حامدی صاحب کے سفرنامۂ فلپائن میں استعمال شدہ صحیح آیت یوں ہے:۔

وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ...... الخ

(الانفال - ۶۳)

عورت کی دِیت کا مسئلہ

پروفیسر محمد طاہر القادری کے بیانات پر تبصرہ

از جناب مولانا گوھر رحمٰن صاحب شیخ الحدیث۔ مدرسہ تفہیم القرآن، مردان

عورت کی دیت کا مسئلہ کافی عرصہ سے زیر بحث ہے۔ اہل سنت والجماعۃ کے پانچوں فقہی مکاتبِ فکر حنفیہؒ، شافعیہؒ، مالکیہؒ، حنابلہؒ اور اہلِ ظاہر (غیر مقلدین) کی متفقہ رائے یہی ہے کہ عورت کے قتلِ خطا کی دیت نصف ہے۔ شیعہ حضرات کی فقہِ جعفریہ میں بھی عورت کی دیت نصف ہے۔ اور ابن علیہؒ اور الاصمؒ کے مبینہ قول کے علاوہ پوری اُمتِ مسلمہ کا تعامل و تواتر اور سنتِ خلفاء راشدینؓ ۱؎ بھی یہی ہے۔ حکومتِ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل اور مجلسِ شوریٰ کی رائے بھی قوم کو معلوم ہو گئی ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے۔ ملک کے اندر اور باہر مختلف مکاتبِ فکر کے جو مستند مراکزِ فتویٰ اور تعلیمی و تحقیقی ادارے ہیں ان مراکز اور اداروں کا فتویٰ بھی عورت کی دیت کے نصف ہونے کے حق میں ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس مسئلے کو زیرِ بحث ہی نہ لایا جاتا، اس لیے کہ یہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان اجماعی مسئلہ ہے اور اس کی دلیل سنتِ رسولؐ، سنتِ خلفاء راشدینؓ، اجماعِ صحابہؓ اور تعاملِ اُمت ہے لیکن حیرت بھی ہے اور افسوس بھی کہ جناب پروفیسر محمد طاہر القادری صاحب کو ائمہ اربعہ اور تعاملِ اُمت سے

۱؎ حدیث: علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین۔ (ت۔ س)

اختلاف ہے۔ فی نفسہ اختلاف رائے کوئی بری چیز نہیں ہے۔ لیکن اجماعِ صحابہ، تعاملِ اُمت، ائمہ اربعہ، فقہِ ظاہریہ اور فقہ جعفریہ سب کی متفقہ رائے سے اختلاف کرنا تعجب انگیز بھی ہے اور افسوسناک بھی ہے، کیونکہ خیر القرون اور اس سے متعلقہ ادوار کے اجتماعی فہمِ دین پر یہ اختلاف خطِ تنسیخ کھینچتا ہے اور بہترین [illegible] سے اعتماد کو ختم کرتا ہے۔

محترم جناب قادری صاحب نے نوائے وقت کے ایک ملی ایڈیشن میں دعویٰ کیا ہے اور یہ چیلنج دیا ہے کہ عورت کی دیت کے نصف ہونے کے ثبوت میں کوئی روایت صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ حدیث اور اقوالِ صحابہ کا ثبوت تو پیش کر دیا جائے گا، لیکن اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ قادری صاحب کا دعویٰ سچا ہے تو پھر میں درخواست کروں گا کہ عورت کے قتلِ خطا کی دیت کے نصف ہونے کے خلاف، زخموں کی دیت کے بارے میں نہیں، کسی ایک صحابی یا تابعی یا تبع تابعی یا ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کا کوئی قول پیش کیا جائے تاکہ اجماع کے دعوے کو غلط ثابت کیا جا سکے۔

پروفیسر محمد وارث میر صاحب کے ریمارکس

نوائے وقت کے ملی ایڈیشن میں شائع شدہ انٹرویو جناب پروفیسر محمد وارث میر صاحب نے لیا ہے۔ دو پروفیسروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کی تمہید میں جناب میر نے تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ اقبال کے خیال میں ۵۰۰ سال تک اسلام اس لیے جامد اور غیر متحرک رہا ہے کہ مسلمانوں نے اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے اور اسلام کی ہیئت و ترکیب میں جو اصولِ حرکت کارفرما ہے، اُسے اجتہاد کہتے ہیں۔ نئی نسل کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے وہ سلف کے علمی سرمایہ سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں، لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

اس سلسلے میں مجھے پہلی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں تھا جسے اقبال نے آ کر کھولا ہو۔ سورہ النساء ۸۳ اور توبہ ۱۲۲ میں استنباط و تفقہ کا حکم دیا ہے۔ ۲۰ آیات میں لفظِ فقہ، ۴ آیات میں لفظ تدبر، ۱۸ آیات میں لفظ فکر، ۴۹ آیات میں لفظ عقل اور ۱۳۵ آیات

ہیں عقل کے قریب المعنے لفظ قلب کا ذکر آیا ہے۔ ان تمام آیات میں غور و فکر اور فقہ و اجتہاد کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر منصوص مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے دیانت دار ماہرینِ شریعت کے اجتماعی اجتہاد و مشاورت کا حکم دیا ہے۔ (مجمع الزوائد) حضرت معاذ بن جبل کو اجتہاد کرنے کی اجازت دی ہے (ابوداؤد)۔ ابوبکرؓ و عمرؓ کی مستقل پالیسی تھی کہ غیر منصوص سنئے مسائل کا حل مسلمانوں کے نمائندہ علماء و فقہاء (رؤس الناس) کے اجتماعی اجتہاد و مشاورت کے ذریعے تلاش کرتے تھے (سنن دارمی۔ سنن کبریٰ از بیہقی، مسند احمد۔) حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام اپنے مشہور مکتوب میں نصوص کے نہ ملنے کی صورت میں قیاس و اجتہاد سے کام لینے کی ہدایت فرمائی تھی۔ (سنن دارقطنی۔ سنن بیہقی۔ کنز العمال)۔

یہ بات بھی امر واقعہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اجتہاد کو نظر انداز کر رکھا ہے، اس لیے اسلام جامد اور غیر متحرک رہا ہے۔ اسلامی فقہ کی کتابوں میں ہزاروں مسائل مدون شکل میں موجود ہیں اور ہر نئے مسئلے کا جواب ان کتابوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ آج کے دور جدید میں بھی جدید ترین مسائل پر اجتہاد و تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔

رہی یہ بات کہ اسلاف کے فیصلے نئی نسل کے راستے میں روک نہیں بن سکتے[1]، تو اس بارے میں میری گذارش یہ ہے کہ اسلاف کی انفرادی اور شخصی آراء تو نئی نسل کے فقہاء و علماء کے راستے میں یقیناً روک نہیں بن سکتیں، مگر سنتِ رسولؐ، سنتِ خلفاء راشدین اور اسلاف کے اجماعی فیصلے یقیناً روک بن سکتے ہیں۔ اگر منصوص اور اجماعی مسائل میں بھی "نئے مجتہدین" کو "نئے اجتہاد" کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو یہ وہ بے لگام آزادیٔ رائے ہوگی جسے کوئی بھی اسلام کا وفادار شخص جائز نہیں ٹھہرا سکتا۔ اجتہاد کا راستہ کھلا ہے، اسے نہ کسی نے بند کیا ہے اور نہ کوئی علمی تحقیق کا راستہ بند کر سکتا ہے، لیکن اجتہاد کا دائرہ محدود ہے، غیر محدود نہیں ہے، مشروط

---

[1] یوں عملاً بھی اور فکری طور پر بھی ایک بڑے طبقے کے لیے خود قرآن اور سنت بھی کوئی روک نہیں ہیں (ف۔ رحمٰ)

ہے، غیر مشروط نہیں ہے اور وہ یہ ہے:-

۱- نئے حل طلب مسائل میں اجتہادی فیصلے کیے جائیں گے۔ نصوص یا اجماع کے ذریعے پہلے سے طے شدہ مسائل میں اجتہاد آرائی اور رائے زنی کی اجازت اسلام نے نہیں دی۔

۲- پہلے سے طے شدہ احکام کو حالاتِ حاضرہ پر منطبق کرنے کے لیے بھی اجتہاد کرنا پڑے گا۔

۳- اسلاف اور ائمہ اجتہاد کے درمیان اختلافی مسائل میں حالات کے تقاضوں، ضرورت اور مصلحت کے پیشِ نظر کسی ایک رائے کو ترجیح دینے کے لیے بھی اجتہاد کا راستہ کھلا ہے۔

۴- مُباحات و مصالحِ مرسلہ کے وسیع دائرے میں مصالح، استحسان، مفادِ عامّہ یا عرف و رواج کے مطابق قانون سازی کرنے کے لیے بھی اجتہاد کا راستہ کھلا ہے۔

مذکورہ بالا چار اُمور میں بھی اجتہاد کا حق ظاہر ہے کہ ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہے۔ "اجتہادِ کم نظراں" کی جن خرابیوں کی طرف اقبالؒ نے اشارات کیے ہیں ان سے تو پروفیسر میر صاحب بھی واقف ہیں، بلکہ اس کے لیے اجتہادی بصیرت و فقاہت اور تقویٰ و دیانت دونوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اور مجتہدین کے وضع کردہ اُصولِ اجتہاد کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ یہ اُصولِ اجتہاد فقہائے کے من گھڑت نہیں ہیں، بلکہ قرآن و سنت سے ثابت شدہ اور مستنبط شدہ اُصول ہیں۔ اُمورِ طبیعیہ اور سائنس و ٹیکنالوجی کے دائرے میں نئے نئے انکشافات و تجربات کرنے کی تو آزادی دی جاسکتی ہے لیکن اُمورِ شرعیہ یعنی شرعی قوانین و احکام میں کھلی چھٹی نہیں دی جاسکتی۔ بلکہ قرآن و سنت کے اُصولِ اساسی کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے اہلِ اجتہاد کو اجتہاد کی اجازت دی گئی ہے۔

عورت کے قتلِ خطا کی دِیَت کا مسئلہ اجماعِ صحابہ اور تواترِ اُمت سے ثابت ہے اور طے شدہ مسئلہ ہے کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے۔ اختلاف جو کچھ بھی ہے زخموں کی دیت میں ہے۔ ظاہر ہے اس کو ۵ فی صد سے بھی کم "مغرب زدہ خواتین و حضرات" کے مطالبے پر یورپین ماڈل کے مجتہدین کے اجتہاد کا تختۂ مشق تو نہیں بنایا جاسکتا۔ اسلام نہ تو "مُلّا ازم" ہے اور نہ "ماڈرن ازم"[1] ہے،

[1] اور بالفاظِ دیگر نہ "مسٹر ازم" یا "پروفیسر ازم"! (مدیر۔ ص)

بلکہ قرآن و سنت کے احکام کی وفاداری کا نام اسلام ہے۔

۲۔ دوسری بات پروفیسر میر صاحب نے اپنی تمہید میں یہ کہی ہے کہ میں ایسے متعدد علماء کو جانتا ہوں جو حکومت کو قرآن کے اصولِ حرکت (اجتہاد) سے آگاہ کرنے کے لیے بے تاب ہیں، لیکن " پیشہ ور الزام تراشوں کی بد ذوقی" کے پیشِ نظر اپنی زبانیں بند رکھے ہوئے ہیں۔

معلوم نہیں حضرتِ میر کے علم میں کون سے وہ علماء ہیں جو " الزام تراشوں" سے ڈرتے ہیں۔ میرے علم ہی میں نہیں بلکہ ملک کے لاکھوں مسلمانوں کے علم میں تو ایسے بے شمار حق پرست اور حق گو علماء موجود ہیں جو شریعت کا حکم بیان کرتے وقت نہ کسی حکمران سے ڈرتے ہیں اور نہ کسی کی جانب سے رجعت پسند اور " کٹر ملا" ہونے کی پھبتی کسے جانے سے ڈرتے ہیں۔ نہ کوئی طمع اور لالچ اُن کو حق گوئی سے روک سکتا ہے۔ اور نہ وہ " بدذوق الزام تراشوں" میں شمار ہونے کے خوف سے طے شدہ اجماعی مسائل میں اجتہاد آرائیاں کرتے ہیں۔

۳۔ تیسری بات جناب میر صاحب نے یہ ارشاد فرمائی ہے کہ جناب پروفیسر محمد طاہر القادری صاحب نے اجتہادی کاوشوں کے جاری رکھنے کی محض بات ہی نہیں کی بلکہ عورت کی دیت کے مرد کے برابر ہونے کے لیے عملاً اجتہاد بھی کیا ہے۔ اور ۸ اگست کو کابینہ کے خصوصی اجلاس میں صدر مملکت نے بھی قادری صاحب کو مدعو کیا۔ اس اجلاس میں عورت کی نصف دیت کی مخالفت میں قادری صاحب کے زورِ دلائل نے سب کو متاثر کیا۔

ہم جیسے "بیرونِ خانہ" لوگ " اندرونِ خانہ باتوں" سے تو واقف نہیں، لیکن اس اجلاس میں ملک کے ممتاز اور معروف و مستند علماء دین بھی موجود تھے، جن کے علم اور خیالات اور تحریروں سے ہم پہلے سے آگاہ ہیں، مثلاً مفتی سیاح الدین صاحب اور مفتی تقی عثمانی صاحب۔ کیا ان کو بھی متاثر کیا تھا؟ کیا ملک کے ہزاروں ماہرینِ شریعت علماء کو بھی متاثر کیا تھا؟ اور عام مسلمانوں کی کتنے فیصد تعداد کو متاثر کیا تھا؟ اور یہ تاثر مثبت تھا یا منفی تھا؟ اِن سوالات کے جوابات دیئے بغیر سب کو متاثر کیا کا فقرہ نِرا دعویٰ ہے۔ میر صاحب! ذرا اس کی وضاحت بھی کر دیجیے کہ متاثر ہونے والے کون ہیں؟ کتنے ہیں؟ اور کیسے ہیں؟

پروفیسر محمد طاہر القادری کے ارشادات کا تجزیہ

نوائے وقت میں جناب قادری صاحب کے جو دعوے اور دلائل شائع ہوئے ہیں انہی کا ذکر شاید انہوں نے کابینہ کے اجلاس میں کیا ہوگا، جن سے بقول پروفیسر صاحب سب متاثر ہوئے تھے۔ مسئلے کو سمجھنے اور شبہات کے ازالے کے لیے ترجمان القرآن کے جون اور ستمبر ۱۹۸۴ء کے شماروں میں شائع شدہ مضامین کافی اور شافی ہیں۔ میں قارئین کو ان کے مطالعے کا مشورہ دیتا ہوں۔ یہاں بہ تقاضائے ضرورت مبینہ دلائل کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

پروفیسر قادری صاحب کی پہلی دلیل سورۃ بقرہ کی آیت ۱۷۸ میں قصاص اور راضی نامے کی صورت میں بدلِ صلح کا حکم مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں ہے، لہٰذا قتلِ خطا کی صورت میں دیت بھی دونوں کی برابر ہونی چاہیے! عورت کی دیت کے نصف ہونے کے اجماعی حکم سے جن دو تین حضرات نے انکار کیا ہے، ان کے خیال میں یہی پہلی اور مضبوط دلیل ہے جس سے دیت کی مساوات ثابت ہوتی ہے اور اسی کو یہ لوگ بنیادی دلیل سمجھتے ہیں۔

تبصرہ و تجزیہ ا۔ قتلِ عمد ایک سنگین جرم ہے جس کی سزا قصاص ہے اور اس سزا کا ذکر قرآن کریم میں متعین طور پر بغیر کسی اجمال و ابہام کے اور بغیر کسی استثناء و تخصیص کے عمومی الفاظ میں کر دیا گیا ہے۔ اس کی مزید تشریح سورۂ مائدہ کی آیت ۴۵ میں کی گئی ہے جس میں مطلقاً "جان کے بدلے جان" کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیثِ رسولؐ میں ہے کہ "سب مسلمانوں کا خون برابر ہے"۔ قصاص چونکہ خون کا بدلہ ہے اس لیے مرد اور عورت کے لیے قصاص کا حکم برابر ہے اور یہ بھی اجماعی حکم ہے۔ اس واضح اور غیر مبہم حکم میں نہ تو ظنی دلیل سے تخصیص جائز ہے اور نہ کسی اور دلیل سے اس عام حکم میں تخصیص کی گئی ہے۔

ب۔ بدلِ صلح راضی نامے کی صورت میں قصاص کا بدل ہے جس کے ادا کرنے سے قاتل اپنے آپ کو موت سے بچاتا ہے۔ قصاص چونکہ دونوں کے لیے یکساں ہے اس لیے بدلِ صلح بھی دونوں کے لیے یکساں ہے۔ مگر مقدار مقرر نہیں۔ جس مقدار پر بھی مصالحت ہوئی ہو وہی ادا کرنی پڑے گی۔ پوری دیت بھی ہو سکتی ہے، آدھی بھی ہو سکتی ہے اور کچھ لیے بغیر بھی معاف

کیا جاسکتا ہے۔

7- لیکن قتلِ خطا قتلِ عمد کی طرح کا جرم اور گناہ نہیں ہے۔ بلکہ صرف شدید بے احتیاطی اور بے پروائی ہے جس کی سزا کفارہ مقرر کی گئی ہے۔ کفارے کا تعیّن بھی قرآنِ کریم میں کر دیا گیا ہے کہ غلام آزاد کیا جائے گا یا ۶۰ روزے رکھنے پڑیں گے، لہٰذا کفارے کے متعین اور غیر مبہم حکم میں بھی نہ تخصیص جائز ہے اور نہ تخصیص کسی دوسری دلیل سے ہوتی ہے ــــ مگر دیت قصاص کا بدل نہیں ہے۔ جب قتلِ خطا کی صورت میں سزائے موت شریعت نے مقرر نہیں کی اور سزائے موت دینا جائز ہی نہیں ہے تو دیت اُس کا بدل کیسے قرار دی جا سکتی ہے؟ اگر یہ قصاص کا بدل ہوتی تو اس کا ادا کرنا خود قاتل پر واجب ہوتا۔ جیسا کہ قتلِ عمد کی صورت میں بدلِ صلح ادا کرنا قاتل پر ہے۔ عاقلہ پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ دراصل قتلِ خطا کی دیت مقتول کے وارثوں کی امداد اور معاشی پریشانی کا کسی حد تک ازالہ اور مالی نقصان کی تلافی کرنے کے لیے ہے جو اجتماعی کفالت کے اُصول پر قاتل کے عاقلہ (خاندان یا ہم پیشہ لوگوں) پر لازم قرار دی گئی ہے۔ قاتل نے چونکہ عمداً کوئی جرم نہیں کیا، اس لیے خود اس پر نہ قصاص ہے اور نہ ہی دیت دینا لازم ہے۔ اس سے صرف ایسی بے احتیاطی ہوئی تھی، جس کے نتیجے میں نادانستہ یا غیر ارادی طور پر ایک جان ضائع ہوئی اس لیے اس کی سزا کفارہ دینا ہے۔ جو قاتل پر لازم ہے مگر کفارہ عاقلہ پر لازم نہیں ہے۔ قتلِ عمد اور قتلِ خطا کے ان واضح احکام کے درمیان جو فرق ہے، معلوم نہیں قادری صاحب نے اس پر کیوں توجہ نہیں فرمائی؟

د ــ باقی رہی یہ بات کہ سورۃ النساء کی آیت ۹۲ میں قتلِ خطا کی دیت ادا کرنے کا حکم عام ہے۔ اور مذکر کے صیغے میں بالاجماع عورتیں بھی شامل ہیں، اس لیے اس عموم و اطلاق میں خبرِ واحد اور اقوالِ صحابہؓ کے ذریعے تخصیص و تقیید جائز نہیں ہے تو اس سلسلے میں گذارش یہ ہے کہ ایک ہے "نفسِ وجوبِ دیت" جس کا ذکر قرآن میں واضح طور پر بغیر کسی تخصیص کے اور بغیر کسی اجمال و ابہام کے کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا دیت کا واجب ہونا مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مرد کے قتلِ خطا کی دیت تو واجب ہو اور عورت کے قتلِ خطا کی دیت واجب نہ ہو۔ اور دوسری بات ہے "قتلِ خطا کی دیت کی مقدار" اس بات کا ذکر قرآنِ کریم

میں نہ صیغۂ خاص کے ذریعے ہوا ہے اور نہ صیغۂ عام کے ذریعے کیا گیا ہے بلکہ سرے سے ذکر ہی نہیں ہوا[1]۔

قادری صاحب سے گذارش ہے کہ زیربحث مسئلہ دیت کا وجوب نہیں ہے بلکہ دیت کی مقدار موضوعِ کلام ہے۔ قادری صاحب نے خود اپنے انٹرویو میں تسلیم کیا ہے کہ دیت کے تفصیلی احکام ہمیں حدیثِ رسولؐ سے ملتے ہیں۔ اگر قرآن کریم میں واضح طور پر بغیر کسی ابہام و اجمال کے مرد اور عورت دونوں کی دیت کی شرح اور مقدار یکساں بیان کردی گئی ہوتی تو پھر آپ کہہ سکتے تھے کہ قرآن کے عموم میں تخصیص جائز نہیں ہے مگر ایسا تو نہیں ہے۔ اصل صورتِ حال یہ ہے کہ نفسِ وجوبِ دیت کا حکم واضح بھی ہے اور عام بھی ہے، لیکن مقدارِ دیت کا حکم مجمل ہے، عام نہیں ہے۔ قرآن کے ایسے مجمل و مبہم حکم کی تشریح خبرِ واحد یا اقوالِ صحابہ سے ہوسکتی ہے، بلکہ قرآن کی تفسیر و تشریح کا صحیح طریقہ ہی یہی ہے کہ اس کو احادیث و آثار کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ احادیثِ رسولؐ اور اقوالِ صحابہ اور اجماعِ اُمت کو نظرانداز کرکے ذاتی آراء کی روشنی میں تفسیر کرنا تو تفسیر بالرائے ہے جس کی رسول اللہؐ نے مذمت کی ہے اور ایسا کرنے والے کو عذاب کی خبر سنائی ہے۔ تفسیر بالرائے تو کہتے ہی ایسی تفسیر کو ہیں جو صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین اور اسلاف کی متفقہ تفسیر سے بے نیاز ہوکر کی جائے اور وہ ان سب کے خلاف ہو، ورنہ مطلق رائے کا استعمال اور تدبّر تو قابلِ مذمت نہیں ہے، بلکہ قابلِ تعریف ہے۔ قادری صاحب کے اس طرزِ استدلال سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے عام اور مجمل کے فرق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور دونوں کے کھلے فرق کو نظرانداز کردیا ہے۔ بہرحال مجھے گذارش یہ کرنی تھی کہ یہ "بیانِ مجمل" کا مسئلہ ہے "تقییدِ مطلق" یا "تخصیصِ عام" کا مسئلہ نہیں ہے۔ اُصولِ فقہ کے کسی قاعدے کا حوالہ دینے سے قبل بہتر ہوتا کہ موصوف اُصولِ فقہ کی نزاکتوں کو سمجھنے کی سعی فرماتے۔

---

[1] کیا قرآن میں کہیں بھی مرد یا عورت یا دونوں کی اکٹھی مقدارِ دیت مذکور ہے؟ اِن میں

محترم پروفیسر قادری صاحب کی دوسری دلیل

پروفیسر قادری صاحب کا دعویٰ ہے، جسے انہوں نے چیلنج کے انداز میں پیش کیا ہے کہ عورت کی آدھی دیت کے حق میں کوئی روایت صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ اگر کسی نے پیش کر دی تو میں اپنے موقف سے دستبردار ہونے کے لیے تیار رہوں۔ صرف معاذ بن جبلؓ کی حدیث بیہقی نے نقل کی ہے جسے اس نے خود ضعیف قرار دیا ہے۔ یہ حدیث صحاح ستہ اور بیہقی کے علاوہ دوسری کتب احادیث میں موجود نہیں ہے۔ جس نے بھی نقل کیا ہے بیہقی ہی سے نقل کیا ہے اور بیہقی اس کا ماخذ ہے۔ اور بیہقی سے پہلے کسی نے اس کو اپنی کتابوں میں نقل نہیں کیا، اسے پہلی مرتبہ بیہقی نے نقل کیا ہے۔ یہ ہے قادری صاحب کے دعوے کا خلاصہ۔ اب آیئے اس کا تجزیہ کریں۔

تبصرہ و تجزیہ

۱۔ پہلی بات تو مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ چلیے تھوڑی دیر کے لیے آپ کی بات تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن کیا آپ قتلِ خطا میں مرد اور عورت کی دیت کے مساوی ہونے کے حق میں اور نصف دیت کے خلاف کسی ایک صحابیؓ، تابعی، تبع تابعی (قرونِ مَشْهُودٌ لَهَا بِالْخَيْر) کا قول صحیح سند کے ساتھ نہ سہی، ضعیف سند کے ساتھ صحاح ستہ میں سے نہ سہی، دوسری کتابوں میں سے، بیہقی سے پہلے کی کتابوں میں سے نہ سہی، اس کے بعد کی کتابوں میں سے پیش کر سکتے ہیں؟ مگر اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ قتلِ خطا کی دیت کے مساوی ہونے کی بات ہو رہی ہے، زخموں کی دیت میں ۳/۱ تک مساوی ہونے کے اقوال موجود ہیں جن کا آپ نے بھی حوالہ دیا ہے اور ترجمان القرآن کے جون کے شمارے میں ہم نے بھی حوالے دیئے ہیں۔ اگر قتلِ خطا کی دیت کے مساوی ہونے کے حق میں اور نصف دیت کے خلاف آپ کوئی ضعیف روایت بھی نقل نہیں کر سکتے تو پھر یہ اجماعِ صحابہ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ بعد کے فقہا نے اس اجماع کو تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے اور سوائے ابن علیہ اور الاصم کی جانب منسوب قول کے کسی فقیہ نے پوری دیت کا فتویٰ نہیں دیا۔ آخر یہ واضح تعاملِ اُمت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ قرونِ ثلاثہ کے اجماع کے بعد اگر کسی بڑے سے بڑے فقیہ اور مجتہد کا فتویٰ بھی دیت کے مساوی ہونے کا موجود ہوتا، پھر بھی خلافِ اجماع ہونے کی وجہ سے قابلِ قبول نہ ہوتا، تا بہ دیگراں چہ رسد۔ ابن عُلَیّہ اور اصم اور چودہ سو سال بعد تین چار یا چھ سات افراد کی رائے

کس طرح اجماعِ صحابہ اور تعاملِ اُمت اور سنتِ خلفائے راشدین کے خلاف قابلِ قبول بن سکتی ہے؟[1] آپ اُصولِ فقہ کے قواعد کا حوالہ دیتے ہیں تو خود بھی ان قواعد کے مطابق بات کیجیے۔ اگر آپ جواب میں کہتے ہیں کہ اجماع قرآن کے خلاف حجت نہیں ہے تو قرآنِ کریم میں کہاں لکھا ہے کہ مرد اور عورت کی دیت برابر ہے؟ قرآن میں تو صرف یہ آیا ہے کہ مرد اور عورت دونوں کی دیت واجب الاداء ہے، یعنی ادا ہونی چاہیے۔ قرآن و سنت کے خلاف اجماع تو سرے سے ممکن ہی نہیں ہے ورنہ پھر رسول اللہ کی یہ بات نعوذ باللہ غلط ثابت ہو جائے گی کہ میری اُمت گمراہی پر کبھی بھی متفق نہیں ہو سکتی بلکہ خود قرآن کی یہ بات غلط ثابت ہو جائے گی کہ اُمتِ مسلمہ، اُمت وَسَطْ اور بہترین اُمت ہے۔ جب قرآن کے خلاف اُمت متفق ہو جائے تو پھر یہ عادل اور بہترین اُمت کیسے قرار پائے گی۔

ب - اگر یہ سوال کیا جائے کہ اجماع صحابہؓ، تعاملِ اُمت اور سنتِ خلیفہ راشد کی سند اور دلیل کیا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ قرآن و سنت کی تعبیر و تاویل پر یا کسی ضعیف الاسناد حدیث کی بنیاد پر یا کسی قیاسی اور اجتہادی دلیل کی بنیاد پر جو قطعی اور صریح دلیل کے خلاف نہ ہو، اجماع ہے[2]

[1] اور ان اصحاب کا دارومدار بھی ابن علیہ اور اصم پر ہے۔ گویا سارا اجتہاد صدیوں میں نمودار ہونے والے ایسے دو افراد کے اقوال پر کھڑا ہے جنہیں سوائے چند کتاب خوانوں کے اُمت کے خاص و عام جانتے تک نہیں ــ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے بعد کے دور میں کوئی محقق یہ انکشاف کرے کہ فلاں وکیل اور فلاں پروفیسر اور فلاں ایڈیٹر مساواتِ دیت کا قائل تھا۔ (ف ـ ص)

[2] اجماع منعقد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اہل خلافت (اہل شوریٰ اور علماء و قضاۃ کسی ضعیف الاسناد حدیث کی کمزور سند کے ساتھ اُس مجموعی ذہن اور عملی روش (سنت) کو دیکھتے ہیں جو یہ واضح کرتی ہے کہ ایک معاملہ اگرچہ کمزور سند کے ساتھ ریکارڈ ہوا ہے، مگر اصلاً وہ درست تھا۔ یہ اتفاق ہے کہ قبولِ عام کی وجہ سے زیادہ چھان بین نہ ہوئی اور بہت سی مضبوط روایات ریکارڈ پر نہیں آسکیں۔ لیکن صحابہ اور قرونِ اُولیٰ کی سوسائٹی جسے حضورؐ نے خاص تربیت سے تیار کیا تھا۔ خود اس کا طرزِ عمل بھی تو ایک ریکارڈ ہے۔ کسی معاملے میں یہ طرزِ فکر و عمل غیر اختلافی ہو تو وہ (باقی بر صفحہ آئندہ)

منعقد ہو جائے تو وہ قطعی حکم بن جاتا ہے اس لیے کہ اجماع قطعی دلیل ہے۔ چونکہ اجماع کے قطعی دلیل ہونے کا مسئلہ ہمارے درمیان اختلافی نہیں ہے اس لیے اس کے دلائل بیان کرنا تحصیلِ لاحاصل اور طولِ لاطائل ہے اور اجمالی بیان اور اشارات میں نے کر دیئے ہیں۔

ج۔ دوسری بات قادری صاحب سے پوچھنی ہے کہ اگر امام بیہقی کے نزدیک یہ حدیث بالکل ناقابلِ استدلال ہے اور شدید ترین درجے کا ضعف رکھتی ہے تو پھر انھوں نے مرد اور عورت کے قتل کی دیت کے برابر ہونے کا فتویٰ کیوں نہیں دیا؟ بیہقی نے تو اپنے امام شافعیؒ کے مسلک کی تائید کی ہے اور اُن کا قولِ جدید یہ بیان کیا ہے کہ قتلِ نفس اور زخموں دونوں کی دیت نصف ہے، جب کہ امام شافعی کا قولِ قدیم یہ تھا کہ زخموں کی دیت ⅓ تک برابر ہے اور اس کے بعد زخموں کی دیت بھی قتل کی دیت کی طرح نصف ہے، جیسا کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا مسلک یہی ہے، لیکن بعد میں امام شافعیؒ نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ آپ کہتے ہیں کہ جس نے یہ حدیث نقل کی ہے اُس نے فیصلہ بھی کر دیا ہے کہ حدیث ضعیف ہے، لیکن حدیث نقل کرنے والے نے تو ضعیف کہنے کے باوجود فیصلہ اُس کے مطابق کیا ہے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیہقی کے نزدیک بھی اس حدیث کی کمزوری سند کے اعتبار سے ہے، اصل مضمونِ حدیث درایتاً قابلِ قبول ہے اس لیے کہ اس کی تائید میں اجماعِ صحابہؓ اور تعاملِ اُمت اور سنتِ خلفاء راشدین موجود ہے۔ پس یہ حدیث ضعیف الاسناد ہونے کے باوجود "مؤیَّد بالتّعامُل" ہونے کی وجہ سے قابلِ استدلال اور قابلِ عمل ہے۔

د۔ تیسری بات یہ ہے کہ جرح "غیر مفسّر" معتبر نہیں ہے، یعنی حدیث یا اس کے راوی کے ضعیف ہونے کی وجہ بیان کیے بغیر ضعف اور جرح کا حکم لگانا قابلِ قبول نہیں ہے۔ جرح کو توثیق و تعدیل پر ترجیح دینے کا قاعدہ اس صورت کے لیے مقرر کیا گیا ہے جب اس کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

بجائے خود ایک دلیل محکم ہے۔ اس پر اُس وقت بھی اور بعد کے ادوار میں بھی اجماع منعقد ہوتا ہے اور پھر یہ اجماع خود بھی دلیل بن جاتا ہے۔ (ف۔ ح)

واضح طور پر مجروح و مطعون ہونے کی وجہ بھی بیان کی گئی ہو۔ اس لیے کہ جرح و تعدیل اجتہادی چیز ہے، ایک کا اجتہاد دوسرے کے خلاف حجت نہیں بن سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک کے خیال میں کوئی چیز عیب ہو اور دوسرے کے نزدیک وہ عیب نہ ہو، تو جب تک کوئی راوی سب کے نزدیک بالاجماع مجروح نہ ہو یا کسی نے اس کا کوئی حقیقی عیب ثابت نہ کیا ہو اس وقت تک اس کی روایت کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

اس اصول کی مزید وضاحت کے لیے درج ذیل کتب کا مطالعہ کیا جائے۔

— ۱ الکفایہ فی علم الروایہ از خطیب بغدادیؒ متوفی ۴۶۳ھ،
طبع مدینہ ص ۱۰۸، ۱۰۹

— علوم الحدیث از ابن صلاحؒ متوفی ۶۴۳ھ
طبع مدینہ ص ۹۶

— لسان المیزان از ابن حجرؒ متوفی ۸۵۲ھ، جلد ۱ ص ۱۶ (شرح نخبة الفکر از ابن حجر)

— الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل از مولانا عبدالحی متوفی ۱۳۰۴ھ
ص ۹۶ تا ۹۹۔

— مقدمہ اعلاء السنن فی قواعد علوم الحدیث از مولانا ظفر احمد عثمانی متوفی ۱۳۹۴ھ طبع کراچی۔ فصل ۶۔ ص ۱۰۳ تا ۱۲۱۔

۳ — چوتھی بات یہ ہے کہ بیہقیؒ نے عورت کی دیت کے نصف ہونے کی یہ روایت حفص بن عبداللہ حدثنی ابراہیم بن طهمان عن بکر بن خُنیس عن عبادہ بن نُسَیّ عن ابن غنم عن معاذ بن جبلؓ کی سند کے ساتھ نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ عبادہ بن نُسَیّ سے یہ روایت دوسرے سند کے ساتھ بھی نقل ہوئی اور اس کے سند میں ضعف ہے۔ (سنن کبریٰ باب دیت المراة۔ جلد ۸۔ ص ۹۵)۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیہقیؒ نے دوسری سند کو ضعیف کہا ہے جو سنن کبریٰ کے باب دیت السمع میں اس طرح نقل کی گئی ہے۔ رِشدین بن سعد عن

عبد الرحمٰن بن زیاد بن اَنْعُم الافریقی عن عُتبہ بن حُمید عن عُبادہ بن نُسی عن ابن غَنْم عن معاذؓ بن جبل ۔ (سنن کبریٰ از بیہقی جلد ۸ ، ص ۸۵) اس سند میں رشدین بن سعد اور عبد الرحمٰن بن انعم افریقی آتے ہیں جن کو امام بیہقیؒ نے متعدد مقامات پر ضعیف قرار دیا ہے ۔ امام ترمذی نے بھی سنن ترمذی میں ان کو متعدد مقامات پر ضعیف قرار دیا ہے ۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں بھی ان دونوں پر کافی جرح کی گئی ہے ۔ عورت کی دیت کے بارے میں بھی دوسرا سلسلہ سند یہی ہوگا جو کانوں کی دیت کے بارے میں نقل ہوا ہے اور اس کا ضعف مذکورہ بالا دو راویوں کی وجہ سے ہوگا ۔ (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص ۱۶۹) ۔

راویوں کے مطعون ہونے کا دعویٰ

جناب پروفیسر قادری صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ "اس حدیث کے راوی حفص بن عبد اللہ بکر بن خُنَیس اور ابراہیم طہمان بھی مطعون ہیں"

قادری صاحب کو میزان الاعتدال میں ان راویوں پر جرح اور اعتراض کے کچھ اقوال شاید مل گئے ہوں گے ۔ لیکن اگر جرح کے چند اقوال تلاش کر لینے ہی کو تحقیق کا حق ادا کرنا سمجھ لیا جائے اور دوسری جانب کے اقوال کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر لیا جائے تو امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ تک مطعون قرار دے دیئے جائیں گے ، جرح تو لوگوں نے اُن پر بھی کی ہے ۔ بلکہ امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری کی روایات اور ان کے راویوں پر بھی جرح کرنے والوں نے جرح کی ہے ۔ جرح و تعدیل کے کچھ اُصول ہیں ، اُن کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے ۔ اِن اُصولوں کی جانب اشارہ اور متعلقہ کتب کا حوالہ سطور بالا میں دے دیا گیا ہے ۔ لیکن آیئے ذرا تفصیل کے ساتھ مذکورہ حدیث کے راویوں کے حالات معلوم کریں کہ وہ کیسے تھے؟

ا ۔ حفص بن عبد اللہ بن راشد ابو عمرو النیشاپوری متوفی ۲۰۹ھ ۔

میزان الاعتدال ہی کے مصنف شمس الدین ذہبیؒ تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں :-

" نیشاپور کے عالم اور قاضی تھے ، ابراہیم طہمان کے شاگرد تھے ، اس سے انہوں نے بہت سی روایات حاصل کی تھیں ...... امام نسائیؒ نے فرمایا ہے کہ ان میں کوئی عیب نہیں تھا ۔ ابن عقیل فرماتے ہیں کہ یہ ۲۰ سال تک قاضی رہے ہیں اور یہ فیصلوں

میں اپنی ذاتی رائے کو دخل نہیں دیتے تھے" (تذکرۃ الحفاظ - جلد ۱ ص ۳۶۸)۔
حفص بن عبداللہ کے ترجمے پر ذہبیؒ نے بخاری، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ کی جانب اشارہ کرنے والے حروف لکھے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ مذکورہ ائمہ کے راویوں میں سے ہیں۔ ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہ صَدُوق یعنی راستباز اور سچے راوی تھے (تقریب التہذیب ص ۷۸)۔
۲۔ ابراہیم بن طہمان الامام الحافظ ابوسعید الہروی النیشاپوری المتوفی ۱۶۳ھ
(امام بخاریؒ کے استاد) اسحٰق بن راہویہ فرماتے ہیں یہ صحیح حدیثیں نقل کرنے والے تھے۔ امام احمد نے ان کو صالحین میں شمار کیا تھا۔ ذہبی نے اس پر صحاح ستہ کا نشان (ع) لگایا ہے یعنی ان سب کی کتابوں میں ان کی روایات نقل ہوئی ہیں (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۱۳)۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ یہ ثقہ راوی تھے۔ اس پر مرجئہ ہونے کا الزام لگایا گیا تھا لیکن کہا جاتا ہے کہ اس نے ارجاء سے رجوع کر لیا تھا (تقریب - ص ۲۰)
واضح رہے کہ مرجئہ کا الزام امام ابوحنیفہؒ پر بھی لگایا گیا تھا۔ بلکہ ابن ابی الحدید نے تو شرح نہج البلاغہ میں مرجئہ کے مذہب کا بانی حضرت معاویہؓ کو قرار دیا ہے (نعوذ باللہ)۔ دراصل بدعتیوں کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنی بدعت کو اہلِ سنت کے ائمہ کی جانب منسوب کرتے رہتے ہیں۔
دوسری بات یہ ہے کہ مرجئہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو عمل کو سرے سے ضروری ہی نہیں سمجھتے تھے، یہ مرجئہ اہلِ بدعت اور مرجئہ ملعونہ کہلاتے ہیں۔ دوسری قسم ہے مرجئہ اہلِ سنت یا مرجئہ مرحومہ جو عمل کو ضروری اور لازمی سمجھتے ہیں لیکن عمل نہ کرنے والے کو ملتِ اسلامیہ سے بالکل خارج نہیں سمجھتے بشرطیکہ عقیدہ درست ہو ایسے مرجئہ تو تمام اہلِ سنت ہیں (الملل والنحل از شہرستانی۔ التمہید فی بیان التوحید از ابو شکور سالمیؒ)۔
بہرحال صحاحِ ستہ کے راویوں کو ملعون کہنا نہ انصاف ہے اور نہ تحقیق ہے، بلکہ کچھ اور چیز ہے۔ خطیب بغدادیؒ نے ابراہیم بن طہمان کی توثیق یحییٰ بن معین اور دوسرے ائمہ سے نقل کی ہے اور مرجئہ ہونے کے الزام کا ذکر کر کے اس کی حقیقت بھی بیان کی ہے کہ یہ اہلِ بدعت والا ارجاء نہیں تھا، بلکہ اہلِ سنت والا ارجاء تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے! (تاریخ بغداد از خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ طبع بیروت جلد ۶ - ص ۱۰۵ تا ۱۱۱)

۳ ۔ بکر بن خُنَیش الکوفی:۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ عابد اور صدوق تھے، بغداد میں رہائش اختیار کر لی تھی، لیکن اُن سے غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں، مگر ابن حبانؒ نے ان کے بارے میں افراط (انتہا پسندی) سے کام لیا ہے۔ ابن حجر نے اس پر ترمذی اور ابن ماجہ کا نشان لگایا ہے۔

تاریخ بغداد میں اگرچہ لَیْسَ بِمَتْرُوک کا قول بھی نقل ہوا ہے۔ یعنی یہ بالکل قابلِ ترک نہیں ہے۔ لیکن زیادہ اقوال لَیْسَ بِشَیٍٔ، متروکٌ، ضعیف وغیرہ کے آئے ہیں یعنی یہ کچھ بھی نہیں ہے، قابلِ ترک ہے اور ضعیف ہے۔ مگر یہ جرح "غیر مفسّر" ہے۔ یعنی مطعون ہونے کی وجہ بیان نہیں کی گئی۔ اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے غیر واضح جرح معتبر نہیں ہے (تاریخ بغداد جلد (۴) ص ۸۸ تا ۹۰)۔

بہرحال امام ترمذیؒ نے اس کی روایات نقل بھی کی ہیں اور ان پر استدلال بھی کیا ہے۔ اس لیے یہ اگرچہ اعلیٰ درجے کے ثقہ تو نہیں ہیں لیکن قابلِ قبول ہیں۔

۴ ۔ عُبادہ بن نُسَی الکندیؒ:۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ اور فاضل شخص تھے (تہذیب التہذیب فی الکنی ۔ نمبر ۱۷۲۸، تقریب ص ۱۶۵)۔

۵ ۔ عبد الرحمٰن بن غَنْم الاشعری متوفی ۷۸ھ:۔

یہ ثقہ کبار تابعین میں سے تھے اور ثقہ تھے، بلکہ بعض کے نزدیک صحابی تھے (تقریب ص ۲۰۸)

یہ ہیں وہ راوی جن کو قادری صاحب مطعون اور ناقابلِ قبول کہتے ہیں۔ قارئین خود فیصلہ کر لیں کہ بات کتنی ہے اور اُسے کیا بنا کر عوام کی عدالت میں پیش کر دیا گیا ہے (حالانکہ اس کے لیے موزوں اور مناسب جگہ سپریم کورٹ کا شرعی بنچ ہے جو ان علمی باریکیوں کو سمجھ سکتا ہے۔

س ۔ پانچویں اور آخری بات اس حدیث کے بارے میں مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ حدیث راویوں کے دونوں سلسلوں کے اعتبار سے سنداً ضعیف ہے پھر بھی یہ درایتاً اپنے مفہوم کے اعتبار سے قابلِ استدلال ہے اس لیے کہ سلفِ صالحین کا عمل اور اُمت کا تعامل اس کے مطابق ہے (تَلَقِّی بالقبول)۔ امام جصاص حنفی فرماتے ہیں:

" تعاملِ امت کی وجہ سے خبرِ واحد بھی متواتر حدیث کا درجہ حاصل کر لیتی ہے مثلاً لونڈی کی طلاق کی آخری حد بھی دو ہے اور اس کی عدت بھی دو حیض ہے۔ یہ خبرِ واحد اور غریب ہے ... اس کا راوی صرف ایک ہے، لیکن تعاملِ امت کی وجہ سے یہ ... (احکام القرآن - جلد ۱ ص ۳۸۶)۔

بغیر عذر کے جمع بین الصلاتین کی ممانعت کی حدیث، وارث کے لیے وصیت کی ممانعت کی حدیث اور قاتل کو مقتول کی میراث سے محروم کرنے کی حدیث اور اس نوع کی متعدد احادیث ہیں، جو سنداً اگر چہ کمزور اور ضعیف ہونے کے باوجود تعاملِ امت کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ قابلِ قبول ہیں، بلکہ حدیثِ متواتر کے درجے کی ہیں۔ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ ترمذی جب ضعیف حدیث کے بارے میں کہتا ہے کہ اس پر اہلِ علم کا عمل ہے تو اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ سلف کے عمل کی وجہ سے یہ حدیث ضعیف ہونے کے باوجود قابلِ عمل اور قابلِ استدلال ہے۔ مولانا عبدالحیؒ نے " الاجوبۃ الفاضلۃ" میں اس قاعدے کی بڑی اچھی تفصیل بیان کی ہے اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے بھی مستند کتابوں کے حوالے سے مثالیں دے کر اس قاعدے کو ثابت کیا ہے۔ (مقدمہ اعلاء السنن فی قواعد علوم الحدیث ص ۳۹ - ۴۰)

عبداللہؓ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت

معاذ بن جبلؓ کی حدیث کی صحت کے دلائل (یا سنداً ضعیف ہونے کے باوجود درایتاً حدیث مقبول ہونے کے دلائل)، تو آپ نے دیکھ لیے، اب دوسری حدیث مرفوع ملاحظہ کیجیے!

" عبداللہ بن عمرو بن عاص فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر ہے یہاں تک کہ ثلث تک پہنچ جائے۔"

— سنن نسائی کتاب القود، باب عقل المراۃ۔

— سنن دارقطنی، کتاب الحدود والدیات۔

— جامع الاصول، کتاب الدیات۔

— جامع الاصول، کتاب الدیات۔

— مصنف عبدالرزاق جلد ۹ - ص ۲۹۶ -

— کنز العمال جلد ۱۵ ص ۵۳ ۔
— منتقی الاخبار مع نیل الاوطار۔ کتاب الدیات، باب دیۃ المرأۃ ۔
— بلوغ المرام از ابن حجر عسقلانی، کتاب الدیات ۔

اس حدیث کو اگرچہ حنفیہ کی کتابوں میں ضعیف قرار دیا گیا ہے اور اس کے ضعف کی بنیاد پر حنفیہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قتل اور زخموں کی دیت قلیل کثیر دونوں میں نصف۔ شافعیہ کا مسلک بھی یہی ہے، لیکن مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔ شہرۂ آفاق محدث ابن حجرؒ نے بلوغ المرام میں لکھا ہے کہ ابن خزیمہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ بلوغ المرام کی شرح سبل السلام میں بھی اس حدیث کو صحیح کہا گیا ہے۔ اس کی سند میں اگرچہ اسمٰعیل بن عیاش آیا ہے، جس پر جرح کی گئی ہے، لیکن اس کی توثیق بھی کئی لوگوں نے کی ہے۔ صحاح ستہ کی مشہور کتاب سنن نسائی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ اس حدیث میں ایک تہائی کے بعد زخموں اور قتل دونوں کی دیت کے نصف ہونے کا صریح حکمِ رسولؐ موجود ہے۔

عمرو بن حزم کی روایت (مکتوب نبوی): قادری صاحب فرماتے ہیں کہ عمرو بن حزم کے ذریعے اہل یمن کے نام جو مکتوب رسول اللہؐ نے بھیجا تھا، اس میں یہ جملہ موجود نہیں ہے کہ "عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے"۔

یہ جملہ یقیناً احادیث کی متداول کتابوں میں موجود نہیں ہے۔ اور ابن حجرؒ نے "تلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر" میں لکھا ہے کہ یہ جملہ اس مکتوب طویل میں موجود نہیں ہے جو عمرو بن حزم کے ذریعے اہلِ یمن کو بھیجا گیا تھا۔ لیکن "رافعی کبیر" اور ابن قدامہ نے المغنی جلد ۸، ص ۴۰۲ پر مسئلہ نمبر ۶۸۵۰ میں مکتوب نبوی میں اس اضافے کو نقل کیا ہے۔ ان دونوں اور دیگر محققین اہل علم نے جب اس اضافے کو نقل کیا ہے تو کسی مآخذ سے ہی نقل کیا ہوگا۔ ان پر عدم اعتماد کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔ جبکہ اس کی تائید میں معاذ بن جبل کی حدیث [illegible] حدیث اور اقوال [illegible] بھی موجود ہیں۔ لیکن یہاں اصل استدلال عمرو بن حزم کی [illegible] پر نہیں ہے۔ جبکہ معاذ بن جبل کی حدیث، عبداللہ بن عمرو بن عاص کی حدیث، اقوال [illegible]

اجماعِ امت اور سنتِ خلفائے راشدین میرے اصل دلائل ہیں

پروفیسر قادری صاحب کی ایک اور دلیل | رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ "مرد مومن کے قتل کی دیت ۱۰۰ اونٹ ہیں" یہ حدیث عام ہے اور اس میں مرد اور عورت کا فرق بیان نہیں کیا گیا۔

تبصرہ و تجزیہ | اس حدیث کے صحیح اور عام ہونے سے انکار نہیں ہے، لیکن معاذ بن جبلؓ کی حدیث [illegible] کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ قابلِ قبول ہے بلکہ قوی تر دلیل کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی طرح اجماعِ صحابہؓ نے اس کے عموم میں تخصیص کر دی ہے کہ نفس مومنہ سے مراد مرد ہے، عورت کا حکم دوسری روایات میں بیان ہوا ہے۔ حدیث کی تخصیص و تشریح دوسری احادیث سے بھی ہو سکتی ہے اور اجماعِ امت سے بھی ہو سکتی ہے۔ یہ حدیث کے نسخ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ حدیث کی تعبیر و تشریح کا مسئلہ ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ امت کے مجتہدین جب کسی تعبیر پر متفق ہو جائیں تو وہی تعبیر صحیح سمجھی جائے گی۔ اس کے مقابلے میں انفرادی تعبیر و تشریح کی قانونی حیثیت کچھ نہیں ہوگی۔

قادری صاحب کی ایک اور بنائے استدلال | حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا "مسلمانوں کا خون برابر ہے"۔ جناب قادری صاحب کا دعویٰ ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مرد اور عورت کی دیت کی مقدار بھی برابر ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں انہوں نے شیخ عبدالحق صاحب کی کتاب اشعۃ اللمعات، قاضی یوسف کی کتاب المعتصر من المختصر اور مولانا ظفیر الدین کی کتاب اسلام کا نظامِ امن کے حوالے دیئے ہیں کہ یہ حضرات بھی حدیث کی یہی تشریح کرتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک بھی مرد اور عورت کی دیت برابر ہے۔

تبصرہ و تجزیہ | یہ حدیث بالکل صحیح حدیث ہے جسے ابوداؤد، نسائی، مسند احمد، بیہقی اور مستدرک نے نقل کیا ہے۔ امام طحاوی حنفی نے اپنی کتاب مشکل الآثار میں بھی نقل کر کے اس کی تشریح کی ہے۔ [illegible] جلسے میں تقریر کے دوران قادری صاحب ترجمان القرآن کو سامنے رکھ کر حوالے دے رہے تھے جس سے تاثر دیا جا رہا تھا کہ ترجمان القرآن کا جواب دے رہے ہیں لیکن فوری وقت میں شائع شدہ لٹریچر میں ترجمان القرآن کی بحث کا کوئی جواب موجود نہیں ہے، بلکہ دوسروں کی بات کو توڑ مروڑ کر بیان کرنے کا التزام کیا گیا ہے۔ ترجمان القرآن کے جون اور ستمبر کے شمارے

بس درج بالا حدیث کا صحیح مفہوم اور طحاوی اور شیخ عبدالحق کی عبارات کا صحیح مفہوم وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، جس کا جواب اب تک کسی نے نہیں دیا ہے، صرف توڑنے موڑنے کا الزام لگایا ہے (ظاہر ہے کہ الزام صرف دعویٰ ہوتا ہے، جواب یا تحقیق نہیں ہوتی۔ قادری صاحب نے المعتصر کا حوالہ دیا ہے جس سے یہ تاثر لیا جاسکتا ہے کہ یہ امام طحاوی کی مشکل الآثار کے علاوہ کوئی دوسری کتاب ہے، حالانکہ یہ مشکل الآثار ہی کا خلاصہ ہے۔ چند قابلِ توجہ امور درج ذیل ہیں۔

ا۔ طحاوی نے مشکل الآثار میں درج بالا حدیث نقل کر کے تشریح اس طرح کی ہے:۔

"ہم نے سارے اہلِ علم کو اس بات پر متفق پایا ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان قصاص اور دیات میں برابر ہیں اور یہ اُونچ کو نیچ پر فضیلت دینے کی تردید کرتی ہے اور اس میں جاہلیت کی اس رسم کی تردید کی جارہی ہے کہ اُونچ سے نیچ کا قصاص نہیں لیا جاتا تھا۔ اور اس حدیث سے ہم نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اس بارے میں عورتیں بھی مردوں کی طرح ہیں اور مرد کو عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے گا، جس طرح کہ عورت کو مرد کے بدلے میں قتل کیا جاتا ہے۔" (مشکل الآثار، جلد ۲۔ ص ۹)

عربی الفاظ بھی ترجمان القرآن میں نقل کیے گئے ہیں۔ اس عبارت پر غور کرنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ امام طحاوی نے ابتدا میں مردوں کے قصاص اور دیت میں برابری کا ذکر کیا ہے اور آخر میں مرد اور عورت کے درمیان صرف قصاص میں برابری کا ذکر کیا ہے، دیت کی مقدار میں مساوات کا ذکر نہیں کیا۔ اگر امام طحاویؒ مرد اور عورت کی دیت کی مقدار کے برابر ہونے کے قائل ہوتے تو صاف طور پر یہ لکھ دیتے کہ دونوں کی دیت بھی برابر ہے اور فقہ حنفی کی کتابوں میں بھی طحاوی کا مسلک اس طرح نقل نہیں ہوا۔ المعتصر میں امام طحاوی ہی کی یہ بات نقل کی گئی ہے، کوئی نئی بات نہیں کی۔

ب۔ شیخ عبدالحق کی فارسی عبارت دراصل طحاوی کی عبارت کا ترجمہ ہے اور مولانا ظفیر الدین نے شیخ عبدالحق کی فارسی عبارت کا اُردو ترجمہ نقل کر دیا ہے۔ اس کا بھی وہی مطلب ہے جو طحاوی کی عبارت کا ہے کہ قصاص اور وجوب دیت میں اُونچ نیچ اور مرد اور عورت کا فرق نہیں ہے، باقی رہی مرد اور عورت کی دیت کی مقدار کا مسئلہ تو ان تینوں حضرات نے اس مسئلے کو یہاں پر ذکر کیا

ہی نہیں ہے ۔ اس بارے میں شیخ عبدالحق کا مسلک اُن کی عربی شرحِ مشکوٰۃ میں اس طرح بیان ہوا ہے ۔

ان سقط حیاً ثم مات فیجب کمال دیت الکبیر فان کان ذکراً وجبت مائۃ من الابل وان کان انثی فخمسون لان دیتہ نصف دیۃ الرجل (لمعات از شیخ عبدالحق برحاشیہ مشکوٰۃ ص ۳۰۲ باب الدیات)

ترجمہ : " اگر جنین (بچہ) ماں کے پیٹ سے زندہ گرا ہو اور بعد میں مرا ہو تو اس صورت میں پوری دیت واجب ہوگی ۔ اگر لڑکا تھا تو ۱۰۰ اونٹ واجب ہوں گے اور اگر لڑکی تھی تو ۵۰ اونٹ دینے ہوں گے ، اس لیے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے ۔"

قادری صاحب نے فرمایا ہے کہ میں نے مشکوٰۃ کا پورا باب الدیات پڑھا ہے اور یہ کہ شیخ عبدالحق کی کتاب معروفِ عام ہے ، ہر شخص کھلی آنکھوں سے پڑھ سکتا ہے ۔ ہم نے کھلی آنکھوں سے پڑھی تھی اور آپ کے کہنے پر دوبارہ آنکھیں اور زیادہ کھول کر پڑھی ہے ، مگر آپ نے مشکوٰۃ کے حاشیے پر درج بالا عبارت کیوں نہ پڑھی ؟ آپ کی آنکھوں کو تو زیادہ بینا ہونا چاہیے تھا ۔

ج — باقی رہا ابوالولید باجی کا حوالہ جس کے بارے میں قادری صاحب کا دعویٰ ہے کہ اس میں امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ سے بھی مرد اور عورت کی دیت کی برابری کا قول نقل ہوا ہے ۔

جناب مجھے افسوس ہے کہ آپ بہت بڑی زیادتی کر رہے ہیں ۔ آپ نے المنتقٰی کے جس صفحے کا حوالہ دیا ہے ، اسی صفحے اور جلد کے حوالے سے (یعنی جلد ، ص ۸۰) ترجمان القرآن کے جنوری کے شمارے میں پورا عربی متن نقل کر دیا گیا ہے جسے ملک کے ہزاروں قارئین نے پڑھ لیا ہوگا ۔ یہ زیادتی آپ خود اپنے ساتھ کر رہے ہیں ، جب قارئین باجی کی اصل عبارت اور آپ کا دعویٰ پڑھیں گے تو سوچیے کہ وہ کیا رائے قائم کریں گے ؟ آخر یہ معاملہ سپریم کورٹ کے شرعی بنچ کے سامنے تو کسی وقت پیش ہوگا ۔ کیا یہ مغالطے وہاں آپ کو کام دے سکیں گے ؟ پوری عبارت دوبارہ غور سے پڑھیے ۔ اور تلاشِ حق کی نیت سے پڑھیے ۔ اس پوری عبارت کا تعلق زخموں کی دیت سے ہے ، قتلِ نفس کی دیت سے نہیں ہے ، اور آپ اس کو پیش کر رہے ہیں دیتِ نفس میں برابری کے

ثبوت میں۔ آخر یہ استدلال کی کونسی قسم ہے؟ ابوالولید کا مقصد یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ سے امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق بھی روایت منقول ہے کہ زخموں کی دیت قلیل کثیر دونوں میں مرد کی دیت سے نصف ہے۔ اور امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق بھی ان سے ایک روایت آئی ہے کہ زخموں کی دیت ثلث دیہ تک تو برابر ہے لیکن اس کے بعد زخموں کی دیت بھی نصف ہے۔ ترجمان القرآن میں دو واضح قسم کے قرائن سے ثابت کیا گیا ہے کہ انہا علی دیۃ الرجل فی القلیل والکثیر وبہ قال ابوحنیفۃ والشافعی وروی عنہما (ای عن عمرؓ وعلیؓ) مثل قولنا (ای المالکیۃ) میں لفظ "نصف" رہ گیا ہے یا کاتب سے یا خود مصنف سے۔ آپ خود ماشاء اللہ عربی جانتے ہیں کیا علی دیۃ الرجل کے معنے "مرد کی دیت کے برابر" ہو سکتے ہیں؟ کیا لفظ علی کہیں مثل کے معنوں میں آیا ہے؟ وبہ قال کے معنے تو یہ ہیں کہ یہی ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ کا مسلک ہے۔ پھر کیا ان دونوں ائمہ کا مسلک یہی ہے کہ قتل عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر ہے؟ المنتقی میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے مروی جو قول نقل ہوا ہے یہ وہی قول ہے جسے بیہقی نے اس طرح نقل کیا ہے۔ جراحات النساء علی النصف من دیۃ الرجل فیما قل وکثر وجراحۃ الرجال والنساء سواء الی الثلث (سنن کبریٰ جلد ۸۔ ص ۹۶، ۹۷)۔

د۔ قادری صاحب کا دعویٰ ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ کے مخطوطہ میں حضرت عمرؓ سے عورت اور مرد کی دیت میں برابری بھی ثابت ہے۔

میرے پاس مصنف ابن ابی شیبہ کی مطبوعہ پہلی پانچ جلدیں تو موجود ہیں، لیکن باقی جلدوں کا مخطوطہ موجود نہیں ہے اس لیے اصل عبارت میرے پیش نظر نہیں ہے اور قادری صاحب نے عبارت نقل نہیں کی ہے صرف دعویٰ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حضرت عمرؓ سے قتل نفس کی دیت میں برابری کا کوئی قول مروی نہیں ہے، ہاں زخموں کی دیت میں ۱/۳ تک برابری کی ایک روایت حضرت عمرؓ سے مروی ہے۔ قادری صاحب کو چاہیے کہ اصل عربی عبارت کا پورا متن شائع کرائیں تاکہ پتہ چلے کہ بات کیا ہے اور پیش کس طرح کی گئی ہے؟ آخر مصادر و مراجع تک آپ کے علاوہ دوسروں کی بھی رسائی ہو سکتی ہے۔ حقیقت کو محض دعوؤں سے تو چھپایا نہیں جا سکتا۔

اقوالِ صحابہؓ کے ثابت نہ ہونے کا دعویٰ | پروفیسر صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ میں وثوق، اعتماد اور ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ وغیرہم کے اقوال عورت کی دیت کے نصف ہونے کے بارے میں ثابت نہیں ہیں۔

تبصرہ و تجزیہ | اچھا ہوا کہ قادری صاحب نے یہ بحث چھیڑ دی۔ اس کی وجہ سے مجھے بات کو مزید واضح کہنے کا موقع مل گیا ہے۔

ا۔۔ اس بارے میں پہلے تو علمِ اصولِ حدیث کا ایک قاعدہ ذہن نشین کر لینا چاہیے جو یہ ہے کہ تابعی یا تبع تابعی جب اپنے استاد کا حوالہ دیئے بغیر رسول اللہؐ یا کسی صحابیؓ کا کوئی قول یا فعل نقل کرے تو اس کو حدیثِ مرسل کہتے ہیں (بالمعنی العام)۔ ایسی روایت حجت ہے یا نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا قول مشہور یہ ہے کہ حجت ہے، بشرطیکہ راوی خود ثقہ ہو۔ بلکہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک تو یہ ہے کہ تابعی اور تبع تابعی کی حدیث مرسل اس کی حدیثِ متصل سے بھی قوی تر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جب یہ یقین کے ساتھ اپنے شیخ کا نام لیے بغیر رسول اللہؐ یا صحابیؓ کا قول نقل کرتا ہے تو اس کو سند کی صحت اور اپنے شیخ کے ثقہ ہونے پر پورا یقین ہوگا۔

امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ حدیث مرسل حجت نہیں ہے، مگر کچھ شرائط کے ساتھ امام شافعیؒ بھی اسے حجت تسلیم کرتے ہیں۔ وہ شرائط یہ ہیں:

۱۔ مرسل حدیث کی تائید میں کوئی دوسری متصل یا مرسل روایت موجود ہو۔

۲۔ اس کی تائید میں کسی صحابی کا قول یا اکثر اہلِ علم کا قول موجود ہو۔

۳۔ حدیثِ مرسل کے راوی کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ مجروح راویوں سے روایت نقل نہیں کرتے تھے، بلکہ ثقات ہی سے روایات نقل کرتے تھے، ایسے راوی کی مرسل روایت بھی حجت ہے۔ اس قاعدے اور بیانِ مذاہب کے لیے درج ذیل مصادر کی طرف رجوع کیجیے۔

۔۔ الکفایہ از خطیب بغدادی ص ۳۸۴۔ اصولِ بزدوی ص ۱۷۱۔ الاحکام از آمدی جلد ۲ ص ۱۷۷ تا ۱۸۰۔

حضرت عمرؓ نے قاضی مقرر کیا تھا اور حضرت علیؓ کے زمانے تک کوفہ کے قاضی رہے تھے۔ اسی درجہ کے دیگر بڑے تابعین ہیں جن کی مراسیل بالاجماع صحیح اور بمنزلہ متصل تسلیم کی گئی ہیں۔

ج ـــــ ان دو قواعد کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد اب آیئے حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ کے اقوال کے اسانید کی طرف :

۱۔ "امام محمدؒ امام ابو حنیفہؒ سے، وہ حمادؒ سے، وہ ابراہیم نخعی سے اور وہ حضرت علیؓ سے نقل کرتے ہیں کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے قتل میں بھی اور زخموں میں بھی"۔

۲۔ "امام محمدؒ، محمد بن ربان بن صالح قرشی سے، وہ حمادؒ سے، وہ ابراہیم نخعی سے اور وہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں سے نقل کرتے ہیں کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے قتل اور زخموں دونوں میں۔ عمرؓ اور علیؓ دونوں سے مروی اس روایت کے خلاف دوسری روایت پر عمل نہیں کرنا چاہیئے"۔ (کتاب الحجۃ از امام محمدؒ متوفی ۱۸۹ھ طبع لاہور ج ۴ ص ۲۷۸، ۲۸۴)

یہ اس کتاب کا حوالہ ہے جس کے مطالعے کا مشورہ قادری صاحب نے دیا ہے کہ اس کے حاشیے کو بھی دیکھ لیا جائے۔ حاشیے میں زخموں کی دیت کے ثلث تک برابر ہونے تک دلالت کرنے والی روایات کو تو ضعیف قرار دیا ہے اور مطلق دیت کے نصف ہونے کو ثابت کیا ہے۔ لیکن درج بالا حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ حدیث امام ابو حنیفہؒ کی جامع المسانید ج ۲ ص ۱۸۰، اور امام محمدؒ کی کتاب الآثار میں بھی موجود ہے۔ اب بتایئے کہ اس کا کونسا راوی ضعیف اور کمزور ہے اور ابراہیم نخعی کی مراسیل تو بالاجماع صحیح بلکہ اس کی مسندات سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہیں۔ باقی تابعین کی روایت سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ اور دوسرے اصحاب کے اقوال کا تفصیلی ذکر مع حوالہ جات ترجمان القرآن شمارہ جون میں موجود ہے۔

۳۔ امام بیہقیؒ نے اپنے سند کے ساتھ امام شعبیؒ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے۔ "عورتوں کے زخموں کی دیت بھی مرد کے زخموں کی دیت سے نصف ہے، قلیل و کثیر دونوں میں"۔ بیہقی نے اس کے سند پر کوئی جرح نہیں کی اور اس کے بعد ابراہیم نخعی سے حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ کا بھی قول اسی سند کے ساتھ نقل کیا ہے جو امام محمد کی کتاب الحجۃ میں نقل ہوا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا ہے کہ ابراہیم کی سند اگرچہ منقطع ہے مگر شعبی کی روایت کو اس

سے تائید ملتی ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۸ ص ۹۶)

اس کے معنی یہی ہیں کہ بیہقی کے نزدیک شعبیؒ کی حدیث منقطع نہیں ہے۔

واضح رہے کہ امام شعبیؒ علامۃ التابعین الحافظ الامام کے القاب سے یاد کئے جاتے تھے۔ ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے وسط میں پیدا ہوئے تھے۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۷۹)

بعض کے نزدیک ۱۷ھ اور بعض کے نزدیک ۲۱ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی ملاقات ۵۰۰ صحابہ سے ہوئی تھی (بعض کے نزدیک ۱۵۰ صحابہ سے ملاقات ہوئی تھی) ان کی تاریخ وفات میں ۴ اقوال نقل ہوئے ہیں ۱۰۳ھ، ۱۰۵ھ، ۱۰۶ھ، ۱۰۷ھ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی، ج ۱ ص ۵۶۴ تا ۵۹۴ بحوالہ ابن خلکان)

حضرت عمرؓ سے تو اس کی روایت مرسل ہے لیکن حضرت علیؓ سے اس کی روایت بعض محدثین کے نزدیک ثابت ہے۔ صحیح بخاری کتاب الحدود باب رجم المحصن میں شعبیؒ کی روایت یحدث عن علیؓ کے الفاظ کے ساتھ آئی ہے اور حدث کا لفظ براہ راست روایت کے لئے استعمال ہوتا ہے نیز امام بخاری اپنی جامع صحیح میں مرسل اور منقطع روایات لاتے ہی نہیں ہیں ان دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ شعبیؒ کی ملاقات اور روایت حضرت علیؓ سے ثابت ہے۔ بعض کے نزدیک رجم کی حدیث انہوں نے حضرت علیؓ سے سنی تھی جو بخاری میں آئی ہے لیکن دوسری کوئی حدیث براہِ راست حضرت علیؓ سے انہوں نے نہیں سنی۔ بہر حال اگر یہی بات صحیح ہو پھر بھی کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے کہ شعبیؒ کے مراسیل بالاجماع صحیح اور مسندات کی ہم پایہ ہوتی ہیں

اجماع کے ثابت نہ ہونے کا دعویٰ جناب قادری صاحب کا دعویٰ ہے کہ یہ مسئلہ شروع سے مختلف فیہ رہا ہے اور اجماع ہونے کے بیانات جذبات کی شدت کے مظہر ہیں۔ اس کے بعد کچھ اقوال نقل کئے ہیں۔

تبصرہ و تجزیہ آپ نے جو اقوال نقل کئے ہیں اور اس کے علاوہ اور بھی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ سارے اقوال زخموں کی دیت سے متعلق ہیں جو زیر بحث مسئلہ نہیں ہیں۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے۔ اب دوبارہ عرض کر رہا ہوں برائے مہربانی قتل نفس کی دیت کے برابر ہونے کا کوئی ایک قول کسی صحابیؓ، تابعیؒ یا تبع تابعی کا نقل کیجئے، سامنے لائیے، اسے پوشیدہ نہ رکھئے،

بصورت دیگر آپ کے اس دعوے کی آخر کیا حیثیت رہے گی کہ یہ مسئلہ شروع ہی سے مختلف فیہ رہا ہے۔ ابن علیہ اور اصم کا تعارف تو آگے آرہا ہے۔ ان کے علاوہ کسی فقیہ کا قول پیش کیجیے جس نے قتل نفس کی دیت میں برابری کا فتویٰ دیا ہو۔

باقی رہی جذبات کی بات تو کیا امام شافعیؒ، ابن جریر طبریؒ، شمس الائمہ سرخسیؒ، محمد بن المنذرؒ، ابن عبدالبرؒ، ابن جوزیؒ، کاشانیؒ، ابن قدامہ حنبلیؒ، امام قرطبیؒ، ابن رشد مالکیؒ، قاضی شوکانیؒ اور دیگر ممتاز اور مشہور و معروف فقہا و محدثین کا دعوائے اجماع جذبات کا مظہر تھا؟ کیا یہ سب بزرگ جذباتی فیصلے کیا کرتے تھے۔ ہم نے اپنی طرف سے تو اجماع کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ یہ دعویٰ نسلاً بعد نسل چلا آرہا ہے۔ ہم نے تو صرف کتابوں کا حوالہ دے دیا ہے۔ ہم تو کسی ایک امام اور فقیہ کی رائے کے مقابلے میں بھی اپنی رائے پیش کرنے سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ ہم کو اپنا مبلغ علم معلوم ہے۔ قادری صاحب علم و اجتہاد کے اس منصب پر نہ جانے کیسے فائز ہوئے کہ آئمہ اربعہ اہلِ ظاہر اور اہلِ تشیع کے متفقہ قول کو جذباتی کہہ کر بے دریغ رد کر رہے ہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ اجماع سکوتی ہے جو بعض آئمہ کے نزدیک حجت نہیں ہے۔ میں گزارش کروں گا کہ اجماع سکوتی نہیں بلکہ اجماع بہ شکلِ تعاملِ امت و سنت خلفاء راشدین ہے آخر جب حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے عورت کی دیت کے نصف ہونے کا فیصلہ کیا اور یہ خلافت راشدہ کا قانون بنا تو خلافتِ راشدہ کے اختتام ۴۰ھ تک کسی صحابی نے اس پر تنقید کیوں نہ کی۔ اور اختلاف کیوں نہ کیا؟ ۴۰ھ کے بعد بھی قرن ثانی (تابعین) اور قرن ثالث (تبع تابعین) میں کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ اس کے بعد آنے والے محدثین اور فقہا میں سے بھی کسی نے مخالف رائے کا اظہار نہیں کیا (قتل خطا کی دیت کے مسئلے میں) ابن علیہ اور اصم کے علاوہ تو ہم کو کوئی قول فاروقیؓ اور مرتضویؓ فیصلے کے خلاف معلوم نہیں ہے۔ اختلاف آراء جو بھی ہے زخموں کی دیت میں ہے آخر یہ اجماع اور تعامل نہیں ہے تو کیا ہے؟

اجماع کے بارے میں مزید معلومات کے لئے ترجمان القرآن کے ستمبر کے شمارے کا مطالعہ کیجیے۔

ابن علیہ اور ابوبکر الاصم کا تعارف | قادری صاحب نے امام رازیؒ اور ابن قدامہ کے حوالے سے ابن علیہ اور ابوبکر الاصم کا مسلک نقل کیا ہے کہ یہ دونوں دیت میں مساوات کے قائل تھے۔

لیکن رازیؒ نے اس قول کو فقہا کے فیصلے کے مقابلے میں نقل کر کے صرف واللہ اعلم کہا ہے۔ اس کی تائید نہیں کی اور ابن قدامہؒ نے اس قول کو شاذ اور مخالف اجماع کہہ کر ذکر دیا ہے (تفسیر کبیر ج ۱۰، ص ۲۳۳، المغنی ج ۸، ص ۴۰۲)

پہلے تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ عمرو بن حزم کے خط میں عورت کی دیت کے نصف ہونے کے اضافے کو ابن قدامہ نے نقل کیا ہے اور آپ اسے نہیں مانتے، اس لئے کتب احادیث میں یہ اضافہ موجود نہیں ہے، تو کیا ابن علیہ اور اصم کا یہ قول کسی کتاب میں سند صحیح کے ساتھ نقل ہوا ہے؟ اسے بھی تو ابن قدامہ نے نقل کیا ہے اور دوسری کتابوں میں بھی بغیر سند کے نقل ہوا ہے۔ آخر اس قول کا اسنادی وزن کیا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ ابوبکر الاصم کے بارے میں لسان المیزان کے حوالے سے ترجمان القرآن کے جون اور جولائی کے شماروں میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہ معتزلی تھے۔ جن کی رائے اہل سنت کے اجماع کے خلاف قابل قبول نہیں ہے۔ آپ ان کا مرتبہ بڑھانے کے لئے کہتے ہیں کہ مبسوط میں ان کا نام آتا ہے، لیکن اس شدکار دلیل کی روشنی میں یہ بھی تو ملحوظ رکھئے کہ نام اور حوالہ تو ہماری کتابوں (بلکہ امہات الکتب) میں معتزلہ کا بھی آتا ہے بلکہ غیر مسلموں کا بھی۔ فی نفسہٖ بات اگر صحیح ہو تو اس کی تائید بھی کی جا سکتی ہے لیکن آپ یہ ثابت کریں کہ مبسوط یا اہل سنت کی کسی دوسری کتاب میں اصم کے اس قول کی تائید بھی کی گئی ہے۔ طحاوی، باجی اور شیخ عبدالحق کے حوالوں کی حقیقت تو ہم بیان کر چکے ہیں۔

باقی رہا ابن عُلَیّہ تو پہلے یہ ثابت کریں کہ اس سے مراد اسمٰعیل بن عُلَیّہ ہے جو محدثین میں سے تھے اور امام شافعیؒ، امام احمدؒ وغیرہ آئمہ کے استاد تھے۔ اگر اس سے امام شافعیؒ کے استاد مراد ہیں تو کتاب الام میں امام شافعیؒ نے یہ کس طرح لکھ دیا کہ قدیم اور جدید علماء میں سے مجھے ایک عالم بھی معلوم نہیں ہے جو مرد اور عورت کی دیت کی برابری کا قائل ہو۔ (کتاب الام طبع بیروت ۱۹۷۳ء ج ۶، ص ۱۰۶)

اگر واقعی امام شافعیؒ کے استاد کی رائے مساوات کی تھی تو یہ اسے نقل کر کے تردید کرتے یا تائید کرتے۔ ادب سے گزارش ہے کہ ابن عُلَیّہ کے نام سے زیادہ مشہور اسمٰعیل کے بیٹے ابراہیم تھے

اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دیت کی برابری کا قائل ابراہیم بن علیہ ہوگا۔ یہ ابراہیم کون تھا؟ لسان المیزان کے حوالے سے ترجمان القرآن میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہ بدعقیدہ اور گمراہ کن شخص تھا۔ اس پر مزید خطیب بغدادی کا حوالہ پیش خدمت ہے۔

"ابراہیم بن اسمٰعیل ابن ابراہیم بن مقسم ابو اسحٰق البصری الاسدی (متوفی ۲۱۸ھ) یہ ابن علیہ کے نام سے مشہور تھا۔ متکلمین میں سے تھا اور خلقِ قرآن کا قائل تھا۔ امام شافعی کے اس کے ساتھ بغداد میں مناظرے اور مباحثے ہوتے رہتے تھے۔ یہ خبرِ واحد کو دلیل نہیں سمجھتا تھا۔ یہ ابوبکر الاصم کے غلاموں میں سے تھا۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے اس کو ضال اور مضل کہا ہے یعنی گمراہ اور گمراہ کن شخص۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے راستے میں اس سے پوچھا کہ مجھے تو سورۃ انعام میں تضادات نظر آتے ہیں، اس پر اس نے کہا کہ قرآن میں اور بھی بہت سے تضادات موجود ہیں" (نعوذ باللہ) تاریخ بغداد از خطیب بغدادی ج ۶ ص ۲۰ تا ۲۲ نمبر ۳۰۵۴۔

اس مستند حوالے سے ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ ابراہیم بن علیہ ابوبکر الاصم کا غلام اور مصاحب تھا اور یہ دونوں استاد شاگرد معتزلی اور گمراہ کن تھے اور واضح قسم کے قرینے سے ثابت کر دیا ہے کہ اس جگہ ابن علیہ سے مراد ابراہیم کے والد اسمٰعیل بن علیہ نہیں ہیں جب تک آپ تصریح یا واضح اور کھلے قرائن سے یہ ثابت نہ کریں کہ یہاں اسمٰعیل بن علیہ ہی مراد ہے اس وقت تک آپ کو اس کا حوالہ دینے کا اخلاقی حق حاصل نہیں ہے لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ دونوں حضرات بڑے ثقہ اور فاضل افراد تھے پھر بھی اجماع صحابہؓ اور سنت خلفاء راشدین کے خلاف ان کی بات کو قانونی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔[1] خطیب بغدادیؒ نے اسمٰعیل بن علیہ کا تعارف بھی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس کی تعریف میں اقوال نقل کئے ہیں لیکن ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ یہ بھی ابن علیہ کہلاتا تھا مگر وہ اس نام کو پسند نہیں کرتا تھا اور لوگوں کو کہتا تھا کہ مجھے اس نام سے نہ پکارو (علیہ اس کی والدہ کا نام تھا) خلقِ قرآن کے قول کی نسبت

---

[1] موجودہ قانون میں بھی سپریم کورٹ کی قائم کردہ کسی نظیر کے خلاف نیچے کی کوئی عدالت فیصلہ نہیں دے سکتی۔ خواہ ماتحت جج کتنا ہی فاضل و مدبر کیوں نہ ہو۔ (ن ص)

اس کی جانب بھی کی گئی ہے لیکن یہ الزام ہے اور غلط فہمی ہے[1]۔

اخراجات کی کفالت کا دعویٰ قادری صاحب فرماتے ہیں کہ آج کے دور میں بہت سے گھرانوں کے اخراجات کی کفالت کا انحصار عورت پر بھی ہو گیا ہے اور عورت کے مرنے سے مرد کے برابر اور کبھی مرد سے بھی زیادہ نقصان ہو سکتا ہے۔

تبصرہ آپ کو معلوم ہو گا کہ قانون اکثریت اور معاشرے کے عمومی حالات کو ملحوظ رکھ کر بنایا جاتا ہے اور ایسی صورتیں شاذ و نادر ہی ہو سکتی ہے کہ گھرانے کی کفالت کا انحصار عورت پر ہو۔ ایسی صورت میں تغلیظِ دیت کے اصول پر نصف دیت کے علاوہ جرمانہ بطور تعزیر وصول کر کے مقتولہ کے وارثوں کو دیا جا سکتا ہے لیکن قانون وہی بنایا جائے گا جو سنتِ رسولؐ، سنت خلفائے راشدینؓ اور تعامل و اجماع سے ثابت ہے۔ استثنائی صورتوں کے لئے وقتی حل نکالا جا سکتا ہے۔ لیکن قانون شرعی کو شاذ و نادر صورتوں کی وجہ سے بدلا نہیں جا سکتا[2]۔

شدت و عصبیت کی شکایت قادری صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء نے اس مسئلے میں شدت اور عصبیت کی روش اختیار کر لی ہے، حالانکہ اختلاف رائے رحمت ہے اور مجتہدین شدت سے کام نہیں لیتے تھے۔

تبصرہ اختلافی مسائل میں کسی ایک رائے کو ترجیح دی جا سکتی ہے اور ایسے مسائل میں اختلافِ رائے یقیناً رحمت ہے بشرطیکہ دلائل پر مبنی ہو، خود غرضی پر مبنی نہ ہو اور فروعی و اختلافی مسائل کو عصبیت اور شدت کا ذریعہ بنانا یقیناً مذموم ہے۔ لیکن یہ مسئلہ تو اجماعی ہے، اختلافی نہیں ہے پھر باوجود اجماعی ہونے کے ہم نے تشدد اور تعصب سے کام نہیں لیا بلکہ دلائل سے بات

---

[1] شاید اس غلط فہمی کا سبب ابراہیم بن علیہ سے کنیت کی مشابہت ہو (ن۔ص)

[2] عام طور پر افسروں اور سرمایہ داروں کی بیگمات اور ثقافتی سوشل سرگرمیوں کی دلدادہ خواتین پورے طبقہ نسواں کی نمائندہ بنی ہوئی ہیں اور جگہ جگہ تقریروں اور مذاکروں میں یہ ظاہر کر رہی ہیں کہ عورتوں کی بڑی تعداد گھر کی کفالت کرتی ہے حالانکہ ایسا ۵ % بھی نہیں۔ گویا پروپیگنڈے اور پبلسٹی (اور اخبارات کے تعاون) کے زور سے غیر واقعی امر کو واقعی بنا کر دباؤ ڈالنے کی کوشش ہے اور وہ بھی قانون شرعی کے خلاف (ن ص)

کی ہے اور کرتے رہیں گے۔

استحسان و استصلاح پر عمل کرنے کی دعوت پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ دفعِ شر، ضرورت اور مصلحت کے لئے استحساناً اور استصلاحاً قیاس سے ہٹ کر یا شاذ قول[1] پر بھی فیصلہ ہو سکتا ہے اور اس کی مثالیں موجود ہیں۔

تبصرہ بجا فرمایا آپ نے، لیکن استحسان اور مصالح مرسلہ پر قیاس کے خلاف عمل کیا جا سکتا ہے، نصوص اور اجماع کے خلاف مصالح مرسلہ اور استحسان پر عمل کسی طرح بھی جائز نہیں ہے نہ اس کی کوئی مثال ہی ملتی ہے۔ شریعت کا یہ قانون ہماری مصلحت ہی کے لئے تو بنا ہے۔

بین الاقوامی سطح پر اسلام کی بدنامی کا خطرہ قادری صاحب فرماتے ہیں کہ عورت کی دیت کے نصف ہونے کا قانون بنانا بین الاقوامی سطح پر اسلامی آئین کی بدنامی کا باعث بن جائے گا، اس لئے اس خطرے کے پیشِ نظر مرد اور عورت کی دیت کے مساوی ہونے کا قانون بنایا جائے۔

تبصرہ اقوام متحدہ کے منشور میں تمام قوموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی ہے آج کے دور میں تو بین الاقوامی طور پر کئی اقوام اور ممالک بنیادی انسانی اخلاق اور بنیادی انسانی حقوق کو کھلے عام پامال کر رہے ہیں اور ان کو بدنامی کی کوئی پروا نہیں۔ آخر ہم اپنے نظریئے اور عقیدے کے مطابق قانون سازی کرنے میں شرم اور ہتک کیوں محسوس کریں؟ اپنی روایات اور اقدار پر سختی کے ساتھ عمل کرنے والی قوموں کا وقار قوموں کی نظر میں بڑھتا ہے، گھٹتا نہیں ہے۔ آج کی مادہ پرستانہ تہذیب تو پردے، تعدد ازدواج اور مرد و زن کے اختلاط پر پابندی لگانے کو بھی رجعت پسندی اور عورتوں کی غلامی سمجھتی ہے، تو کیا شریعت کی ان پابندیوں کو بھی ختم کرنے کی سفارش قادری صاحب کریں گے؟ آج کے دور کی قومیں تو سیکولر سیاست کی علمبردار ہیں تو کیا ہم سیاست میں مذہب کا نام لینا اور سیاست کو مذہب و اخلاق کا پابند بنانے کی بات کرنا بدنامی

---

[1] دوسروں سے تو یہ مطالبہ کہ آیت قرآنی یا صحیح حدیث لاؤ اور خود یہ اصول بنا لینا کہ کسی کے بھی شاذ قول پر عمل کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ قول خلفائے راشدین اور آئمہ اربعہ اور شیعہ فقہ کے متفق علیہ مسئلے کے خلاف ہو۔ (ن م)

کے خوف سے ترک کر سکتے ہیں؟

جہاں تک عورتوں کے بنیادی انسانی حقوق اور اسلامی حقوق کا تعلق ہے اسلام کا مقابلہ اس سلسلے میں دنیا کی کوئی قوم اور کوئی تہذیب نہیں کر سکتی۔ قرآن و سنت اور فقہ اسلامی میں ان کو جو حقوق دیئے گئے ہیں ان کو کوئی بھی چھیننے کا حق نہیں رکھتا۔ اگر کوئی چھیننے کی کوشش کرے گا تو اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرہ اس کی داد رسی کرے گا۔ اسی طرح عورت انسانی کرامت و شرافت میں کمتر نہیں ہے۔ کرامت کے اسلامی معیار میں جو عورتیں آگے ہوں گی ان کا مقام بھی بلند ہو گا۔ ہم جیسے مرد ازواج رسول، بنات رسول اور صحابیات کی خاکِ پا کو بھی نہیں پہنچ سکتے اور آج بھی ایسی خوش قسمت خواتین موجود ہیں جن کے مقابلے میں مجھ جیسے مرد کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے لیکن شرعی احکام و قوانین کی پابندی ہم سب پر لازم ہے۔ ہمارا رب اور ہمارا رسولؐ ہم سے زیادہ ہمارے مصالح کو سمجھتا ہے۔ اسی شعور کا نام ایمان ہے۔

جاپان، بنکاک اور بنگلہ دیش کا سفر نامہ

جناب خلیل حامدی صاحب

(۲)

موجودہ صدر اور ان کی قومی حیثیت احمد اسماعیل نے بتایا کہ سلامت ہاشم ازہر یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہے۔ جدید مطالعہ کے ساتھ ساتھ اُسے دینی علم پہ گہری نظر حاصل ہے۔ اخلاق و کردار کا بھی اُونچا انسان ہے۔ ان تمام پہلوؤں کے علاوہ احمد اسماعیل کے جانے کے بعد علی خنافی نے ایک اور اہم نکتہ بھی سلامت ہاشم کی مقبولیت کا بتایا۔ وہ نکتہ واقعی دلچسپ ہے۔

مورو قوم کے تین طبقات علی خنافی نے مورو قوم کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ قوم تین طبقوں پر مشتمل ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جو سمندروں میں رہتا ہے اور ماہی گیری وغیرہ ان کا بالعموم پیشہ ہے، نسلی لحاظ سے یہ لوگ "سمر" (گندمی رنگ والے) کہلاتے ہیں۔ یہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں اور دوسرے بھی ان کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ساداتِ مکّہ کے غلاموں کی نسل میں سے ہیں۔ اس طبقے کو تیسرا درجہ حاصل ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو ہے تو کسی حد تک تعلیم یافتہ لیکن اُس کا نسلی تعلق مورو سلاطین میں سے کسی سلطان کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ دوسرے درجے کے لوگ ہیں۔ مثلاً جزیرہ تاوی تاوی کے باشندے اکثر و بیشتر اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور تیسرا طبقہ ان تعلیم یافتہ لوگوں پہ مشتمل ہے جو آلِ سلاطین کہلاتے ہیں۔ سلامت ہاشم ایک سلطان جو سلطان آف قدرت کہلاتا تھا، کی اولاد میں سے ہیں۔ اِس لیے ذاتی صلاحیت اور اخلاقی پاکیزگی کے ساتھ ان کو نسبی عظمت بھی حاصل ہے۔ ان کے مقابلے میں نُور مسواری سولو (" " " s) جزیرے کی تیسری کلاس سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ سلامت ہاشم مورو عوام کی نظر میں جو درجہ اور مقبولیت حاصل کر سکتا ہے نُور مسواری وہ درجہ

اور مقبولیت حاصل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ علی غنانی کا یہ تجربہ میں نے کچھ اور لوگوں سے بھی بیان کیا انھوں نے بھی اس کی تائید کی۔ قبائلی معاشرے میں اس طرح کے تصورات کا پایا جانا بعید نہیں ہے۔

امام مسجد کا کردار ظہر کی نماز ادا کرنے کے لیے میں اور علی غنانی شہر نکل گئے۔ شہر بڑا تو نہیں ہے، لیکن ہے پُر رونق اور منظر آفرین۔ مچھلی مارکیٹ کے سامنے ایک مسجد ہے۔ ظہر کی نماز کے لیے اس میں داخل ہوئے۔ جماعت ختم ہو رہی تھی۔ ہم نے اپنی الگ نماز پڑھ لی۔ جماعت میں شامل لوگوں کی تعداد ۸-۱۰ تھی۔ کچھ حضرات مسجد کے اندر ادھر اُدھر سو رہے تھے۔ نماز کے بعد چند نوجوان اور مسجد میں آگئے۔ امام صاحب سے تعارف ہوا۔ ان کا نام حاجی زین العابدین ابن سلطان توکل زید ہے۔ انھوں نے مکہ معظمہ میں قرآن حفظ کیا ہے۔ عربی اچھی بول لیتے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۵۰ برس کے قریب ہوگی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اس مسجد میں امامت اور خطابت کے فرائض انجام دیتے ہیں، لیکن اس خدمت کا وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے، بلکہ بعد میں اور دوستوں نے بھی بتایا کہ یہاں کے علما جو مساجد میں خدمت انجام دیتے ہیں کوئی تنخواہ نہیں لیتے اور نہ تنخواہ لینا پسند کرتے ہیں۔ اپنا الگ کاروبار کر کے معاش حاصل کرتے ہیں۔ جب ہم امام صاحب سے گفتگو کر رہے تھے تو وہ تمام لوگ جو نماز کے لیے یہاں آئے تھے اس میں شریک ہو گئے۔ بعد میں آنے والے اور نمازی بھی اس محفل میں شامل ہو گئے۔

مسجدوں کا طرزِ تعمیر پوری مسجد لکڑی کی بنی ہوئی ہے۔ ۳۰ سال پرانی ہے۔ لکڑی پر پھول بوٹے تراشے ہوئے ہیں۔ یہاں مسجدیں چوکور بنائی جاتی ہیں۔ محراب، منبر، گنبد اور چھوٹے چھوٹے منارے مساجد کا عالمی نشان ہیں۔ پوری مسجد فرش سے چھت تک دیواروں سمیت لکڑی کی ہے۔ اس کا صحن نہیں ہے، بلکہ کسی مسجد میں صحن نہیں ہے۔ شمال اور جنوب میں مسجد کے طول کے مطابق برآمدے بنے ہوتے ہیں۔ ایک کمرہ بچوں کو قرآن کریم اور عربی زبان کی تعلیم دینے کے لیے ہے۔ دوسرا کمرہ عورتوں کی نماز کے لیے۔ یہاں عورتیں بھی مسجد میں آتی ہیں۔ جمعے کے روز پابندی کے ساتھ، اور تمام نمازوں میں فرصت کے مطابق۔ ہم جس مسجد میں ہیں، پرانی ہونے کے باوجود خوبصورت لگتی ہے۔ لیکن صفائی کا انتظام خاطر خواہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی غربت ہے۔ یہاں کا مسلمان

غریب بھی ہے اور کشتۂ تیغِ ستم بھی۔

ایک امام مسجد سے تعارف امام صاحب حاجی زین العابدین بن سلطان توکل زید نے مجھے رابطۂ عالم اسلامی، مکہ معظمہ کا ایک خط دکھایا۔ یہ خط شیخ محمد علی الحرکان مرحوم کے دستخطوں سے ۱۹۷۲ء میں جاری ہوا ہے۔ [illegible] کی طرف سے حاجی زین العابدین کو ۵ اسو ریال ماہوار تنخواہ پر کینیا (مشرقی افریقہ) میں قرآن کریم کی تعلیم کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ خاکسار نے حاجی زین العابدین سے دریافت کیا کہ آپ ابھی تک کینیا کیوں نہیں گئے؟ اس نے جواب دیا کہ میری بیوی بلڈ پریشر کی مریضہ ہے۔ نہ اسے یہاں چھوڑ سکتا ہوں نہ ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ یہ تو حاجی صاحب کا جواب ہے لیکن مجھے رابطۂ عالم اسلامی کے اس فیصلے پر سخت افسوس ہوا۔ یہ ملک جس میں مورو مسلمان آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور تعلیمی لحاظ سے انتہائی پسماندہ ہیں یہ ملک خود اصحابِ علم و دعوت کا محتاج ہے۔ یہاں سے کسی عالم کو اٹھا کر دوسرے دور دراز ملک میں بھیج دینا دانشمندانہ فیصلہ نہیں ہے۔ اس ملک کے سامنے سچی خیر خواہی یہی ہے کہ یہاں کے اہلِ علم و دعوت کو اسی قوم کے اندر کام پر لگایا جائے۔ امام زین العابدین اچھے سمجھدار، با اثر اور صاحبِ کردار مبلغ معلوم ہوتا ہے۔ ماہی گیروں کے اندر رہنا ہی اس کے لیے مفید ہے۔

فاطمہ ریستوران میں مسجد کے اندر چند اور مسلمانوں سے تعارف ہوا۔ ان میں سے ایک صاحب عبدالبیان تو بہت ہی کھل گئے۔ یہ محاذِ آزادی کے خدمت گاروں میں سے ہیں۔ مسجد سے نکل کر ہم کسی ریستوران کی تلاش میں نکل گئے تاکہ دوپہر کا کھانا کھایا جائے۔ عبدالبیان صاحب نے اس بارے میں ہماری خوب رہنمائی کی۔ وہ ہمیں ایک مسلمان خاتون کے ریستوران میں لے گئے جو تیسرے درجے کا ریستوران تھا۔ خاکسار نے عرض کیا کہ کسی اور ذرا بہتر ریستوران میں چلتے ہیں۔ عبدالبیان صاحب نے جواب دیا کہ ہر جگہ آپ کو چاول اور مچھلی کے بنے ہوئے کھانے ملیں گے۔ اس ریستوران اور اعلیٰ درجے کے ریستوران میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہوگا، البتہ جو کھانا ہم یہاں ۲۰ پیسوں میں کھائیں گے وہی کھانا اعلیٰ ریستوران میں ایک سو پیسوں میں کھائیں گے۔ خاکسار اس کا جواب سن کر سراسیمہ ہو گیا اور

آخر اسی ریستوران میں فاطمہ نامی مورو مسلمان خاتون کا پکا ہوا کھانا کھایا۔ فاطمہ نے جب ٹیبل پہ کھانا سجایا تو مچھلی کی اتنی اقسام سامنے آگئیں کہ اس سے پہلے مچھلی کے ان کرشموں کا مجھے تجربہ نہیں ہوا۔ سائز کے لحاظ سے متعدد قسمیں اور پکانے کے لحاظ سے گوناگوں رنگ۔ [illegible] یہ لوگ ماہی گیر ہیں اور اسی ایک جانور کو غذا بنا کر اس میں تنوع پیدا کر لیتے ہیں۔ کھانے پر ہم تین تھے: خاکسار، علی خنافی اور عبدالبیان۔ خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ اور کل بل ۴۰ پیسو بنا۔

کاروبارِ زندگی میں عورتوں کا حصہ

فاطمہ ریستوران کا یہ پہلو تو اچھا نکلا۔ ریستوران تھا بھی صاف، مگر مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ ایک خاتون نے ریستوران کھول رکھا ہے اور اپنی نوجوان لڑکیوں کو بیرے اور خانسامے بنا رکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ریستوران کو رونق بخشنے کے لیے ڈسکو گانوں کے ریکارڈ بھی آوازِ بلند سے چل رہے ہیں اور ایک لڑکی کاؤنٹر پہ بیٹھی اس شغل کو اپریٹ کر رہی ہے۔ میں نے تو دونوں دوستوں کے سامنے اس پہلو پر سخت تنقید کی اور صاف عرض کیا کہ مجھے معاف فرمایئے، یہ بات اسلام کے قطعاً منافی ہے۔ عبدالبیان نہ کھسیانا ہوا۔ پہلے تو خاموش رہا۔ جرأت کر کے کہنے لگا: "یہاں مسلمانوں کے لیے یہی کام رہ گئے ہیں، وہ اور کیا کام کریں؟" میں نے عرض کیا: "مرد یہ کام کریں" کہنے لگا: "مرد بھی کرتے ہیں اور عورتیں بھی۔ ہمارا معاشرہ مخلوط ہے۔" بہرحال یہ ایک ایسی عام وبا ہے کہ اس میں کسی شخص کو ہدفِ تنقید بنانا لاحاصل ہے، مگر میں نے دل میں یہ طے کیا کہ مورو محاذ کے ذمہ دار لوگوں سے اس موضوع پہ بحث کروں گا۔

کھانا کھا کر باہر نکلے اور ٹہلتے ٹہلتے اپنے ہوٹل کا رُخ کیا۔ بازار میں گزرتے وقت مزید دل خراش مناظر ملے۔ پورے بازار میں فٹ پاتھوں پر بھی اور کھوکھوں میں عورتیں، بوڑھی اور جوان بھی بیٹھی ہوئی ہیں۔ ہر ایک نے تھوڑا تھوڑا سودا لگا رکھا ہے۔ کسی کے پاس دو چار مرغیاں ہیں، مرغی کی قیمت ۴۰ پیسو۔ کسی کے پاس انڈے، دو پیسو فی انڈہ۔ کوئی لکڑی کے تختے لے کر بیٹھی ہوئی ہے، کوئی ماچس اور موم بتی۔ کسی کی چھابڑی میں پھول اور سگریٹ۔ ان کے لباس بھی کوئی ڈھنگ کے نہیں ہیں۔ دکانداروں اور خریداروں میں بے تکلفی کی بھرپور فضا پائی جاتی ہے۔

دریائے کوتاباتو چند قدم آگے نکلے تو ان کھوکھوں کی پشت پر دریا نظر آیا۔ اسے دریائے کوتاباتو کہتے ہیں۔ شمال میں پارانگ (PARANG) سے نکلتا ہے اور جنوب میں دباؤ ـــــ ([illegible]) میں جاگرتا ہے۔ یہ میں نے اس لیے بیان کر دیا کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ مجاہدین مورو کا دریا ہے۔ مینڈاناؤ میں ان کی ساری کی ساری سرگرمیاں اس دریا کے اندر اور اس کے آر پار جاری رہتی ہیں۔ اس کا پاٹ بہت بڑا ہے۔ چپو سے چلنے والی کشتیوں سے لے کر سٹیمر تک اس میں چلتے ہیں۔ مزید تفصیل آگے کہیں آئے گی۔

کوتاباتو شہر کے وسط میں سے یہ دریا گزرتا ہے۔ دریا کا شمالی علاقہ خوشحال ہے اور جنوبی علاقہ غریبوں کا مسکن ہے۔ دریا کے دونوں کناروں پر اور ہر کنارے کے اندر بھی کسی حد تک لوگوں نے اپنے جھونپڑے بنا رکھے ہیں۔ عبدالبیان نے جھونپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ فقرا کے مکانات ہیں۔ خود میرا مکان بھی دریائی جھونپڑا ہے۔ دریا کے کنارے یا اندر جھونپڑا بنانے پر کوئی پابندی نہیں ہے، اس لیے جو لوگ زمین کا ایک مرلہ بھی نہ خرید سکتے ہوں وہ یہاں جھونپڑا بنا لیتے ہیں۔ عبدالبیان یہ بات کرتے ہوئے ہنستا بھی جا رہا تھا جیسے وہ اپنی تقدیر پہ پھبتی کس رہا ہو۔ شمالی علاقہ کی خوشنما عمارتیں اور جنوبی علاقے کے کُلبہ ہائے احزان، یہ عجیب منظر ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

دریا کے پُل پر کافی دیر تک ہم کھڑے رہے۔ برہنہ تن کشتی بان دریا کے اندر اپنی اپنی کشتیاں لیے پھرتے ہیں۔ چند موٹر بوٹیں بھی گزریں۔ سٹیمر بھی سیاحوں کو لیے لیے گھومتا پھر رہا ہے۔ جھونپڑوں سے نیچے اُتر کر مرد اور عورتیں دریا میں غسل کر رہے ہیں۔ پانی اُن کا اوڑھنا بھی ہے اور بچھونا بھی۔ اس دریا نے یہاں بڑے انقلابات دیکھے ہیں۔ مسلمانوں کی عظمت کے اس نے گیت گائے۔ اسپین کے تباہ کن حملوں اور اسپینی درندوں کے ظلم و ستم پر یہ زار زار رویا کیا۔ امریکی استعمار اور پھر جاپانی استبداد بھی اس کی چھاتی پر مونگ دلتا رہا۔ اور اب صلیب پرست مارکوس کی خونخوار فوجیں رہ رہ کر اس کے پانی کو خونِ مورو سے رنگین

کر رہی ہیں۔ دریا نے یہ تمام انقلاباتِ زمانہ دیکھے، مگر مورو سے اُسے جو محبت ہے اُس میں بے وفائی نے راہ نہیں پائی۔ اگر مورو کو کہیں کھانے کو نہیں ملتا تو یہ انہیں اپنی نوع بنوع مچھلیاں پیش کر دیتا ہے اور اگر انہیں مینڈاناؤ کی دھرتی جگہ نہیں دیتی تو یہ اپنا دامن اُن کے لیے وا کر دیتا ہے۔ اس کی موجیں اور مورو کے دلوں کی دھڑکنیں ایک ساتھ چلتی ہیں۔ پس شاد باش شاد زی اے مورو کے ہمدم و ہمسفر۔ تو بہتا جا اور عراقِ دل نشین کے ساز کو چھیڑتا جا۔ وہ دن آنے والا ہے جب تیرے اندر صلیب عکس ریز ہونے کے بجائے توحید کے میناروں کا رُخ تاباں جھلکے گا۔ ناقوسِ تثلیث کے بجائے اذانِ وحدانیت تیرے نغموں سے ہم آہنگ ہوگی ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی بستیوں کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

ماہی گیر مجاہد

عبدالبیان نہایت سادہ اور درویش انسان ہے۔ اس کا لباس بھی نہایت معمولی ہے، مگر اس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ بکھری رہتی ہے۔ عربی بولنے کا اُسے بہت شوق ہے۔ بول لیتا ہے، مگر تکلف کے ساتھ۔ اظہارِ مافی الضمیر میں کامیاب ہوجاتا ہے باتیں تو اُس کی سادہ ہیں، مگر بڑی پُرسوز اور اثر انگیز۔ مجھے کہنے لگا: "ھل تشرّف عُشّتی؟" ان الفاظ کا میرے دل پر جو اثر ہوا میں بیان نہیں کر سکتا۔ شاید اُس نے بڑی سوچ کے بعد یہ الفاظ زبان سے ادا کیے ہوں گے۔ ان الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ: "کیا آپ میرے گھونسلے کو شرف بخشیں گے۔" اُس کے یہ الفاظ محبت اور ندامت دونوں کا عجب امتزاج ہیں۔ محبت اُسے مجبور کر رہی ہے کہ مجھے اپنے گھر بُلائے اور ندامت اس بات پر ہو رہی ہے کہ مہمان کو کُٹیا دکھا کر کیا کروں گا۔ میں نے اُسے زیادہ تشویش میں نہیں ڈالا۔ فوراً عرض کیا: میں آپ کے گھر ضرور حاضری دوں گا، مگر مغرب کے بعد۔ میری اس تجویز کا مطلب یہ ہے کہ دن جن باتوں کو طشت از بام کر دیتا ہے رات کی تاریکی اُس پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ میری حاضری سے عبدالبیان کو خوشی ہو نہ کہ ندامت اور کہتری کا احساس ؎

تاریکی ہی غنیمت تھی فراز   چاند نکلا تو دل ڈوب چلا

غیر مسلم آبادی کے رنگ و روپ

خاکسار، علی غنافی اور عبدالبیان واپس اگورا زول آرہے تھے۔ واپسی پر ہم ایک ایسے بازار سے گزرے جس کی دکانیں اور سٹور چکاچوند رکھتے تھے۔ سامان بھی خوب تھا۔ کپڑے کی دکانیں، جوتے اور کراکری کی دکانیں، زیورات اور سامانِ زیبائش کے شوکیس۔ علی غنافی میرا استفہامیہ چہرہ پڑھتے ہی بولا۔ یہ تمام عیسائیوں کی دکانیں ہیں۔ یہ بنک اور یہ کمپنیاں عام طور پر عیسائیوں کی ملکیت ہیں۔ ان میں مقامی عیسائی بہت کم ہیں۔ زیادہ تر لوگ امریکا اور ہسپانیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان دکانوں میں ایک خاصا بڑا جنرل سٹور تھا جس کا مالک ایک یہودی ہے۔ علی کہنے لگا: یہ معلوم نہیں کہ یہ یہودی کہاں سے آگیا۔ فلپائن کے اصل باشندوں کے اندر تو کوئی یہودی خاندان نہیں ہے۔ ایک اور بڑی عمارت کی طرف انگلی اٹھا کر علی نے بتایا کہ یہ ایک حضرمی عرب کی کمپنی ہے۔ اس کا نام عمر با جنید ہے۔ یہ کافی عرصہ سے یہاں کاروبار کر رہا ہے۔ اِس ملک پر اس کا احسان یہ ہے کہ اس نے سب سے پہلے یہاں مسلمانوں کے لیے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ بہت سے علماء اس کے ادارے کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اور وہ فخر سے کہتے ہیں کہ ہم "جنیدی" ہیں۔

چلتے چلتے جب شہر کے وسط میں اُسی پارک میں آگئے جس کا پیچھے ذکر گزر چکا ہے تو علی پارک کی دیوار پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کو لپک کر ملا۔ جس نے میلی کچیلی پتلون اور معمولی قیمت کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس دیوار پر خوانچے والے بیٹھتے ہیں یا بے روزگار لوگوں کے لیے یہ وقت گزارنے کی جگہ ہے۔ علی نے اپنے دوست کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان کا نام برشلونہ ہے (عجیب و غریب نام) اور یہ صاحب مینڈاناؤ کے ایک قدیم حکمران سلطان کُبُنْگسُوان کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ یہ گردشِ زمانہ ہے، شہزادہ صاحب کے آباؤ اجداد حکمرانی کرتے رہے ہیں اور موصوف فٹ پاتھوں پر بیٹھے ہوئے غالب کے اس شعر کا مصداق بنے ہوئے ہیں ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

رسائل ومسائل

اسلامی تصوّرِ معرفت

سوال: مسلمانوں کا ایک گمراہ گروہ "معرفت" کے نام پر قرآن کریم کی ان تعلیمات کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس لائے، ہندو دیو مالا کے پنڈتوں کے اعمال کے مماثل ثابت کر رہا ہے۔ ہم اس بات کو دینِ اسلام کی اہانت قرار دیتے ہیں۔

حدیث نبوی کے ان الفاظ کی بنا پر کہ اَلْاَوَّلُ لِلدِّيْنِ الْمَعْرِفَةُ ماننے والے ان افراد کے گروہ نے اسلام کی فرض قرار دی ہوئی روزمرہ کی پنجگانہ نماز کی ادائگی کی بہ نسبت زیادہ اہمیت، مقام معرفت کے حصول کو دے رکھی ہے۔

یہ گروہ کسی ایسے شیخ کو اپنا دینی مرشد مانتا ہے جس سے یہ قول منسوب ہے:
مَنْ لَّمْ يَكُنْ لَهٗ شَيْخٌ فَشَيْخُهٗ شَيْطَانٌ ۔ حصول معرفت کی راہ میں یہ گروہ اس قول کو اپنے لیے زادِ راہ بنا رہا ہے۔

ہمیں بڑی مسرت ہو گی اگر آپ کرم فرمائی کر کے معرفت کے موضوع پر کچھ روشنی ڈال سکیں اور ہمیں بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں جنہیں اس راہ کے سالک بننے کا حق حاصل ہے، نیز یہ واضح کریں کہ انسان کب اور کیونکر منزل معرفت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس منزل پر پہنچنے کی غایت کیا ہے۔ ہم اس باب میں تفصیلی وضاحت کا خیر مقدم کریں گے تاکہ ہم اس گمراہ گروہ کو قائل کر کے صراطِ مستقیم پر لا سکیں اور ایسے برخود غلط مرشدوں کی چالوں پر کان دھرنے سے روک سکیں جو اغراض کے بندے ہیں۔

جواب: "معرفت" کا لغوی معنی پہچان ہے۔ یہ علم کا ابتدائی درجہ ہے۔ کائنات اس کے عجیب و غریب اور مستحکم نظام کو دیکھ کر اس کے بنانے والے کے وجود، علم، قدرت اور حکمت کا علم ہوتا ہے اور اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنی زبردست قدرت والا ہے کہ وہ بڑی حکمت والا ہے۔ اس کائنات کو وجود دینے والا اور اس کے نظام کو چلانے والا ہے۔ وہی کائنات اور اس کے اقتدار کا مالک ہے جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے ذلت سے دوچار کر دیتا ہے۔ اسی کے قبضۂ قدرت میں بھلائیاں ہیں۔

"قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شیئ قدیر"

اس معرفت کے نتیجے میں انسان کے دل میں خالق کائنات کے لیے عظمت اور محبت پیدا ہوتی ہے، دوسری تمام چیزوں کو اس کی قدرت کا کرشمہ سمجھ کر ان کے ساتھ اسے مساوات کا احساس ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ اپنے سمیت سب کو اللہ کا غلام دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی فطرت اللہ تعالیٰ (اپنے خالق و مالک اور محسن و مربی) کے احکام کی طلب کرتی ہے۔ اس کی فطری طلب کا جواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے "رسالت و نبوت" کے نظام سے دیا گیا ہے۔ اس نے اپنے رسولوں کے ذریعے اپنے احکام اپنے بندوں تک بھیجے تاکہ "ان الحکم الا للّٰہ" (حکمرانی کا حق صرف اللہ کے لیے ہے) اور "الا لہ الخلق والامر" (سنو وہی پیدا کرنے والا ہے اور اسی کو حق حکمرانی ہے) کی فطرت حقیقت اور پکار کے مطابق انسانی زندگی کا نظام استوار ہو۔

انسان کا اپنی اور کائنات کی اس حقیقت کو سمجھنا اور اپنے اور کائنات کی چیزوں کے مقام کو پہچاننا اور اپنے اور کائنات کے خالق اور اس کی صفات کا ادراک اور اس کے نتیجہ میں بندگی رب کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرنا معرفت ہے۔ اس معرفت کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و حواس کی نعمتوں سے نوازا اور کائنات کو ایک کتاب معرفت بنایا۔ لیکن اس نے کمال رحمت سے مزید انعام یہ فرمایا کہ انسانی رہنمائی کے لیے انسانوں میں سے بعض برگزیدہ

شخصیات کو انسانوں کی رہنمائی کے لیے منتخب فرما کر اپنے احکام کا حامل بنایا اور ان کے ذریعے "کائنات کی کتاب معرفت" کی تعلیم کا انتظام فرمایا اور وہ نظام زندگی جس کی فطرت انسانی طلب گار تھی جس کے ذریعہ انسان نے اللہ کی غلامی اور بندگی کے جذبہ کی تسکین کرنا تھی، بھی انھی کے ذریعے انسانوں کو دیا۔

مذکورہ تصورات اور حقائق کے جاننے کا نام معرفت ہے لیکن محض معرفت ذریعہ نجات نہیں، ذریعہ نجات معرفت سے اُوپر کا درجہ ہے جسے ایمان کہا جاتا ہے۔ ایمان کے ساتھ عمل صالح شامل ہو یعنی بندگی رب عملاً پورے طریقے سے کی جائے تو مکمل نجات ہے اور بندگی رب میں نقص رہ جائے لیکن ایمان ہو تو نجات پھر بھی ہو جائے گی، لیکن بندگی میں کوتاہی کا نتیجہ بھگتنے کے بعد۔

انسانوں کے لیے جس قسم کے مرشد کی ضرورت تھی اُس کا ذکر مذکورہ بالا سطور میں آپ کے سامنے آگیا ہے کہ وہ ایسی شخصیت ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے احکام کا حامل بناتا ہے اور وہ وحی کے ذریعے کتاب کائنات کا انسانوں کو مطالعہ کراتا ہے۔ اس کی یہ تعلیم اور مطالعہ خود اس کی اپنی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اسے وحی کے ذریعے اس پر نازل کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے معرفت اور ایمان کا انتظام اس طرح فرمایا کہ ایک طرف انھیں عقل و حواس کی نعمتوں سے نوازا اور کائنات میں علم و معرفت کے اسرار رکھ دیے تاکہ وہ عقل و فکر اور حواس سے کام لے کر ان اسرار و رموز کو معلوم کرلیں اور پھر انبیا علیہم السلام کے ذریعے مزید رہنمائی فرمائی۔ اس سلسلے کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے کیا گیا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا اختتام ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب و سنت کی شکل میں علم و معرفت کے سارے اسرار و رموز اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائے۔ اب علم و معرفت کا راستہ صرف اللہ کی کتاب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

اس معرفت کے حصول کے لیے سب سے پہلی شرط تو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا علم حاصل کرنا ہے اور دوسرا کام اس نظام کو اپنانا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی

طرف سے بندوں کے پاس لے کر آئے ہیں۔

جو شخص کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا علم نہیں رکھتا اور ان فرائض بندگی کو اختیار نہیں کرتا اور منہیات سے نہیں بچتا جن سے بچنا بندگی رب کا تقاضا ہے اور جن سے کتاب و سنت میں روکا گیا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے فرائض کا تارک ہے اور منکرات کا ارتکاب کرتا ہے وہ معرفت سے کوسوں دور ہے۔ جاہل ہے اور اس کا شیخ شیطان ہے۔

لیکن جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ سنت اور سیرت کو اپنے لیے نمونہ بنایا اس کا شیخ وہ مقدس ہستی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے مبعوث فرمایا ہے کہ لوگ اس کی اتباع اور اطاعت کریں۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفرلکم ذنوبکم ۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ۔ یایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔

آیات قرآنیہ اسی آدمی اور رسول کی اتباع و اطاعت کو لازم کرتی ہیں جسے اللہ نے اسی منصب پر فائز کیا ہو۔ اور اس کی اتباع کو لازم کرتی ہیں، جس کی اتباع میں اللہ کے رسول کی اتباع ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت فرمایا:

"ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بہ کتاب اللہ و سنۃ نبیہ"۔

جو لوگ کسی اور طریقے کی تلاش میں کسی کو اپنا شیخ بناتے ہیں وہ دراصل شیطان کے جال میں گرفتار ہیں۔ اور ان پر یہ بات صادق آتی ہے "فمن لم یکن لہ شیخ فشیخہ شیطان"۔ یعنی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اسوۂ حسنہ اور نظام بندگی کو چھوڑ دیا تو اس کا شیخ اور مرشد شیطان ہے۔ (ناظم شعبہ استفسارات)

مطبوعات

مسلمان بیٹی کا خط اپنے یہودی والدین کے نام مکتوب نگار مریم جمیلہ - ناشر: محمد یوسف خان اینڈ سنز، سنت نگر، لاہور - خوبصورت طباعتی معیار اور رنگین دبیز سرورق - قیمت درج نہیں - یہ ایک کھلا خط ہے جو نومسلمہ محترمہ مریم جمیلہ نے اپنے والدین کو دعوتِ اسلام دینے کے لیے لکھا ہے - اصل خط انگریزی میں ہے - اس کے ساتھ اردو ترجمہ شامل ہے -

یہ محض ایک عام سا خط نہیں ہے بلکہ اس میں مغربی سوسائٹی کا پورا جائزہ لیا گیا ہے جو اپنی تباہی کی طرف جا رہی ہے - اس کی نمایاں خرابیوں کو گنوا کر مریم جمیلہ نے اپنے والدین کے سامنے یہ نتیجہ نکال کر پیش کیا ہے کہ سارے نتائج سیکولرازم اور مادہ پرستی کے ہیں - اپنے والد محترم کو وہ بہت بے تکلفی سے کہتی ہیں کہ آپ جن جدید علوم اور سائنس کے پابند ہیں، کیا وہ مفہومِ زندگی بھی بتا سکتے ہیں؟ موت کیوں آتی ہے اور اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ حسن کیا اور قبیح کیا ہے؟ اور ہمیں اپنے اعمال کی جوابدہی کس کے سامنے کرنی ہے؟ وہ موجودہ احوالِ امریکہ کو روم کے دورِ زوال سے مشابہ قرار دیتی ہیں - پھر کیا خوب کہا کہ "صہیونی تحریک جس کی جدوجہد نے اسرائیلی ریاست کو وجود بخشا ہے - حقیقت میں یہودی قومیت کا لادینی (سیکولر) اظہار ہے - اس طرح کی بحث کے بعد وہ اسلام کی دعوت بڑے دردمندانہ طریق سے پیش کرتی ہیں -

کاش کہ ہم پشتینی مسلمان اس نومسلمہ کی طرح سوچ سکیں -

النظام العقائدی فی الاسلام | تالیف: محمد آصف الافغانی (جامعۃ العلوم الاسلامیہ زرگری کوہاٹ۔ ناشر: ادارۃ البحوث والدعوۃ الاسلامیہ۔ (بہ دارالعلوم متذکرہ) صفحات: ۱۶۲، خوبصورت ٹائیٹل۔ قیمت درج نہیں۔

یہ مختصر سی کتاب عربی زبان میں ہے اور اس کا موضوع اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔ میں نے اسے سرسری طور پر دیکھنا شروع کیا، مگر اس کی عربی زبان اور پُرزور اندازِ نگارش نے مجھے بہت متاثر کیا۔ شروع ہی سے تعارفی صفحات میں جب میں ایمان کے متعلق چند جملے پڑھے تو وہ دل پر چھا گئے۔ اور پھر الحاجۃ الی العقیدۃ (باب اوّل) میں بھی حسن نسویر استدلال اور حُسنِ بیان سے مؤلف نے ضرورتِ عقیدہ و ایمان کو واضح کیا ہے، خوب ہے۔ بقیہ تمام ابواب میں میری توجہ اس امر پر رہی کہ نقطۂ نظر میں کوئی کجی تو نہیں، مگر بحمد اللہ کہ اہل سنت والجماعت کے اجماعی مسلک کے مطابق تمام عقائد پر بحث ہے۔ بیچ میں جا بجا قرآن وحدیث کے علاوہ مغربی مفکرین کے حوالے بھی شامل ہیں۔ اگرچہ ان کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی اور اب وہ معلومِ عام ہیں۔ بہرحال یہ رسالہ قابل قدر ہے۔

ہندوستانی مسلمان | از سید خلیل اللہ حسینی، صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت۔ ناشر: اسلامک سنٹر فار انڈین مینارٹیز اسٹڈیز۔ مدینہ مینشن۔ نارائن گوڑہ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹ ہند۔ قیمت: ۲۰/- روپے۔

آزادیٔ برصغیر سے قبل بھی مسلمان ہندوؤں کے ہاتھوں ستم اُٹھاتے رہے، مگر آزادی اور تقسیم کے بعد تو وہ کئی ہزار منظم مُسلم کُش بلوؤں کا شکار ہوئے اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ اس کتاب میں ان بلوؤں کے احوال کا ایک جائزہ ہے اور اس کا ماحصل یہ ہے کہ ؎

"وہی قاتل، وہی مخبر، وہی منصف ٹھہرے"

مسلم دشمن تنظیمیں سامنے موجود ہیں۔ وہ مسلمانوں کو کھُل کر دھمکیاں دیتی ہیں، فساد کی تیاریاں کرتی ہیں، وقت مقررہ پر حملہ کرتی ہیں، پولیس ان کی علی الاعلان مدد کرتی ہے۔ فوج بھی ان کے آگے دم نہیں مار سکتی۔ اندرا گاندھی تو کیا، کوئی بھی وزیر یا لیڈر تدارک یا فسادیوں کے خلاف

رائے دینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مسلمان مارے جاتے ہیں، ان کے گھروں اور دکانوں اور کارخانوں کو آگ لگائی جاتی ہے، اُن کے مردوں ہی سے نہیں عورتوں اور بچوں سے شدید بہیمیت کا سلوک کیا جاتا ہے، انہیں جلتی آگ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ گھروں کو مکینوں سمیت آگ لگا دی جاتی ہے۔ آخر میں گرفتاریاں بھی مسلمانوں ہی کی زیادہ ہوتی ہیں۔ اور انہیں پر مقدمات چلتے ہیں۔ اور سزائیں ملتی ہیں۔ کلکتہ کے اخبار "سنڈے" کے حوالے سے مؤلف کا یہ کہنا صحیح ہے کہ پہلے آر ایس ایس کے لوگ مسلمانوں کو "ہندیانے" (ہندوستانی بنانے) کی بات کرتے ہیں۔ لیکن اب وہ "ہندوانے" (ہندو بنانے) کی بات کرتے ہیں۔ یہ ہیں معنی انڈیا کے سیکولرزم کے۔

کتاب کا زیادہ حصہ بیانیہ ہے۔ حالانکہ اگر مختلف رپورٹوں اور اخباروں اور سرکاری بیانات کے حوالے دیئے جاتے (جو بہت کم دیئے گئے ہیں) اور ضروری اعداد و شمار شامل کیے جاتے تو اچھا ہوتا۔ علاوہ ازیں ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو ہندوؤں کے مذہبی عقائد کے بے تکے پن (اور ملیچھوں کے متعلق ان کے نظریات) اور منوجی سے بنکم چیٹرجی تک اُن کے مسلم دشمن تصورات کو بیان کرنے کے ساتھ ایک باب میں یہ بتاتی کہ انہوں نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف کیا کیا سازشیں کیں (صرف جنگی حملوں کا مجمل ذکر کیا گیا ہے) پھر انگریزوں کے ساتھ مل کر کس طرح مسلمانوں کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ پھر آزادی کے بعد اُن کے منصوبے (ان کے لیڈروں کے اقوال، نہرو رپورٹ اور ودیا مندر اسکیم اور واردھا اسکیم کی روشنی میں) کیا تھے، پاکستان کی تشکیل کی مخالفت کس کس طرح کی۔ جب تقسیم ملک کا فیصلہ ہو گیا تو مسلم کشی کے طوفان کے ساتھ انہوں نے علاقوں کی تقسیم اور سرحدی خط کے تعین میں سازشیں کر کرکے کیا زیادتیاں کیں، نیز اثاثوں کی تقسیم میں پاکستان کے ساتھ کیا ظلم روا رکھا۔ اور اب وہ تشکیلِ پاکستان کا انتقام ایک طرف ہندوستان کے مسلمانوں کی مسلسل خونریزی اور تباہی سے لے رہے ہیں اور دوسری طرف پاکستان کے خلاف بار بار فوجی طاقت استعمال کرنے کے بہانے نکالتے ہیں اور ڈپلومیٹک سطح پر اور عالمی پروپیگنڈے کے دائرے میں وہ کس طرح پاکستان کو ہر معاملے میں زک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر یہ کام شاید پاکستان یا کسی دوسرے ملک میں زیادہ بہتر طور پر کیا جا سکتا ہے۔

دعوتِ فکر | از محمد نشانِ تابش قصوری۔ ناشر: مکتبہ اشرفیہ، مریدکے (شیخوپورہ)

قیمت: ۱۲/- روپے۔

اوّل تو یہ تعریف کرتا ہوں کہ بریلوی مکتبِ فکر کی اس کتاب کا انداز بیان اُس طرح کا مناظرانہ نہیں ہے جیسا عام طور پر ان حلقوں میں پایا جاتا ہے، لیکن مخالفین کے لیے خوبصورت پیرائیہ بیان کے باوجود کہیں کہیں وہ مخاصمت جھلک پڑتی ہے جس سے اتحاد بین المسلمین کا نازک جذبہ خراشیدہ ہو جاتا ہے۔ دراصل بڑے سائز کی یہ مختصر کتاب ایک فریق (بریلویوں) کا مرتب کردہ کیس ہے۔ دوسرے فریق (دیوبندیوں) کے خلاف۔ دوسرے فریق کی طرف سے اس کا جواب ہمارے سامنے نہیں ہے کہ حتمی فیصلہ کیا جا سکے۔ ہم دونوں کو ملتِ اسلامیہ کا جزو سمجھتے ہیں۔ اور ہر اختلاف کو کھینچ تان کر وجہ تکفیر قرار نہیں دیتے۔ دونوں طرف فکری لحاظ سے کیا کیا افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ اس سے قطعِ نظر آج جو تماشا بادشاہی مسجد میں دکھایا گیا ہے وہ ایسی کتابوں کو بے معنی بنا دیتا ہے۔ پہلے محکمہ اوقاف کی ڈائرکٹری سے ڈاکٹر یوسف گورایہ صاحب کو ہٹوایا۔ پھر اب ان کی مکمل برطرفی ہوئی جبکہ ان کے کیے ہوئے علمی و دیگر کاموں کے لیے صوبے سے مرکز تک تحسین موجود رہی ہے، پھر اب مولانا عبدالقادر آزاد کو دھکیل کر محکمہ اوقاف کی سربراہی اور بادشاہی مسجد کی امامت حاصل کرنے کا پروگرام ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے بعد اتحاد بین المسلمین کے لیے آپ جتنی بھی دعوتِ فکر دیں، عملی اقدامات قوم کو افتراق کی طرف لے جانے والے ہیں۔ حالانکہ اس وقت اصل توجہ الحاد، شریعت دشمنی، مغرب پرستی، اشتراکیت پسندی اور سیاسی و معاشی بگاڑ پر سب کو مل کر صرف کرنی چاہیے۔ سبب جذبۂ اتحاد حقیقت میں غالب آ جائے گا تو دونوں طرف کے حضرات اخوت کے احساس کے تحت اپنی اپنی تحریروں اور اپنے اپنے شعائر پر غور و فکر کر کے ان کی اصلاح کر لیں گے۔

اسبابِ زوالِ اُمت | از چوہدری رحمت علی۔ ناشر: عمران پبلیکیشنز۔ دارالرحمت، ۷ سمامنیر شہید روڈ، اچھرہ۔ لاہور۔ ص ۶۱ قیمت: ۳/۵۰۔

مسلمانوں کے قرونِ اولیٰ کے دورِ عروج کو سامنے رکھ کر کبھی نہ کبھی ہر سوچنے والے کے دل

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر آج کے مسلمان زوال سے کیوں دوچار ہیں ۔ اس موضوع پر بہت سے لوگوں نے لکھا ہے ۔ اس مختصر کتاب میں چوہدری رحمت علی نے صحیح تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ ہمیں کن خرابیوں اور بداعمالیوں نے پست کر دیا ہے ۔

ایک درویش، ایک مجاہد | از نذیر احمد خان سابق لیکچرر ۔ بہ اہتمام : ادارہ معارف اسلامی، منصورہ ۔ لاہور ۔ ناشر : مکتبہ المنار ۔ منصورہ ۔ لاہور ۱۸ سفید کاغذ خوبصورت سرورق ۔ قیمت : درج نہیں ۔

اس کتاب میں چوہدری بہادل خان ناگرہ کی سوانح اور ان کے مطالعۂ کردار پر مشتمل ہے اس میں چوہدری صاحب کے اخلاق کے خاص خاص پہلو سامنے لائے گئے ہیں ۔ میری گواہی بھی یہی ہے کہ یہ مرحوم بزرگ ہمہ تن خلوص، دیانت، محنت، خدمت اور پابندیٔ نظم کے خوگر تھے ۔ تشبیہ، ملازمت، محکمہ تعلیم کی افسری اور ریٹائرمنٹ کے بعد تمام اداروں میں ان کا کردار بے داغ رہا ۔ مرحوم نے اہم متعدد دینی پمفلٹ بھی لکھے ۔ یہ پمفلٹ ایسے تمام لوگوں کو پڑھنا چاہئیں جو زندگی کو سنوارنا چاہتے ہوں ۔

سیرت تابعین | مؤلف : ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت پاشا ۔ مترجم (عربی سے اردو) محمد نصراللہ خان خازن ۔ ناشر : ادارہ معارف اسلامی ۔ لاہور ۔ تقسیم کنندہ : المنار بک سنٹر، منصورہ، لاہور ۱۸ ۔ صفحات : ۱۵۸ ۔ رنگین دبیز سرورق ۔ قیمت درج نہیں ۔

نہایت مفید کتاب ہے ۔ اس میں اکابر تابعین میں سے ۱۲ اصحاب کے احوال پیش کیے گئے ہیں ۔ یہ صرف چند رجال خاص کے احوال ہی نہیں ہیں، بلکہ اس دور کے دینی مزاج اور تہذیبی ماحول اور اخلاقی قدروں کا ایک نقشہ بھی سامنے آجاتا ہے ۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اہل مال و جاہ کے مقابلے میں اہل علم اور اہل کردار کی قدر و قیمت کتنی زیادہ تھی ۔

تفہیم القرآن

جلد ششم

جو کہ ایک عرصے سے ختم ہو چکی تھی۔ اب دوبارہ چھپ

چکی ہے۔ قارئین کرام اپنے آرڈر پیشگی بک کرا سکتے ہیں۔

ادارہ

ترجمان القرآن لمیٹڈ

دربار مارکیٹ (میلارام) لاہور